مزاج بخیر

طنز و مزاح

ڈاکٹر تنویر حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مِزاج بخیر

طنز و مزاح

ڈاکٹر تنویر حُسین

شاہ ویز رویل پبلیکیشنز
لاہور کینٹ

شاہ وہیز رویل پبلیکیشنز
نے
لاہور سے شائع کی

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

مصنف: ڈاکٹر تنویر حسین
سرورق: ریاظ
کمپوزنگ: عامر عباس
مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس 43 نسبت روڈ، لاہور
سنِ اشاعت: 2017ء
تعداد: 500
قیمت: 650/-
اشاعت: چہارم

ملنے کا پتہ:

- مقبول اکیڈمی، اُردو بازار، لاہور
- مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور
- خزینہ علم وادب، اُردو بازار، لاہور
- کالج بک ڈپو، اُردو بازار، لاہور
- علمی بک ہاؤس، اُردو بازار، لاہور
- انیس بک کارنر، مین مارکیٹ گلبرگ، لاہور
- اقبال بک کارنر، مین مارکیٹ گلبرگ، لاہور
- ارسلان بک بینک، نیلا گنبد لاہور۔ 0323-4251011

انتساب

بیٹی عاتکہ

بیٹے عاطف اور عاقب

کے نام

جو گھر میں

مزاحیہ ادب تخلیق کرتے رہتے ہیں۔

ترتیب

1۔	خود نمائی	6
2۔	ولیمہ دنگل	12
3۔	لاہوری ناشتے	16
4۔	اپنا تو بن!	23
5۔	رکشہ......قابلِ رشک سواری	29
6۔	انکل آف روڈ	40
7۔	بسیں اور بے بسی	64
8۔	موٹر سائیکل	71
9۔	پنجابی فلمیں	79
10۔	قوم کا درد یا کام کا درد	88
11۔	سیر لنڈے بازار کی	93
12۔	ہمارے لباس	99
13۔	رضائی	105
14۔	سرکاری اور غیر سرکاری نلکے	111
15۔	بے چاری دیواریں	116
16۔	یا دل نخواستہ	121

17۔ غالب۔کلاس روم میں 126
18۔ نصیحتیں 132
19۔ قبر کرائے کے لیے خالی ہے 141
20۔ ڈیانا......فرشتوں کے روبرو 145
21۔ گھوڑے، گدھے اور انسان 153

خود ہنسائی

میری تاریخِ پیدائش آج تک وہی چلی آ رہی ہے، جو میرے قبلہ والد صاحب نے مجھے پہلی جماعت میں داخل کراتے ہوئے یہ سوچ کر لکھائی تھی کہ برخوردار کی ملازمتی اور ازدواجی زندگی کو پیمانۂ امروز و فردا سے بخوبی ناپا جا سکے۔

نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو کام ہے۔ اَسلاف کے کارناموں پر اتنا بھی نہیں اترا تا کہ خود کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔ جو مجھ سے میری عمر پوچھتا ہے، اسے میں اپنی تنخواہ بتا دیتا ہوں۔ ویسے میری عمر اور تنخواہ ''دونوں گامزن ہیں ایک ہی رفتار سے''۔

چار جماعتیں آٹھ مرتبہ پڑھی ہیں۔ پرائمری سکول میں پڑھتے ہوئے میرے آئیڈیل وہ اساتذۂ کرام تھے، جو صبح دس بجے تبدیلیٔ آب و ہوا کی خاطر سکول آتے تھے۔ ہماری تشنگیِ علم بجھانے کی خاطر وہ نہ صرف کتاب پڑھاتے تھے بلکہ حقہ پیتے ہوئے ہم پر دھواں بھی چھوڑتے تھے۔ جونہی ماسٹر صاحب آتے، ہم میں سے کوئی اُن کی الماری سے اُن کی بیمہ شدہ شلوار اخذ کرنے دوڑ پڑتا۔ کوئی شہتوت کے درخت پر چڑھ کر ہمارے جسم کی عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑانے کے لیے مولا بخش کا اہتمام کرنے لگتا۔

جب ماسٹر صاحب کے مولا بخش کے توسط سے ہمیں دنامن ''سی'' سے نوازا جا رہا ہوتا تو ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

جب گاؤں کے درختوں کے پھلوں، پھولوں، پتوں اور شاخوں سے میرا جی بھر گیا تو مجھے شہر بھیج دیا گیا۔ یہاں میں نے انڈے اور ڈنڈے ایک ساتھ جلتے دیکھے تو سوچ لیا کہ کبھی نہ کبھی میں بھی اپنا پنجابی دل جلا کر اُردو بازار میں رکھ دوں گا۔ میں نے مڈل ورنیکلر میں فرسٹ کلاس لے کر گاؤں والوں کو یہ باور کرا دیا کہ اگر میں چاہوں تو منشی فاضل اور ادیب فاضل کر کے گاؤں کی سیدھی سادی زندگی میں زہر گھول سکتا ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ علم تو دراصل وہ ہے، جس سے گھر والوں کی بجائے باہر والے ڈریں۔ میٹرک میں داخل ہونے سے قبل گھر والوں نے میرے مستقبل کو مزید تابناک بنانے کے لیے مجھے ترغیباً معاشرتی حیوانوں کا ہر شفاخانہ دکھایا تا کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ ہر جسمانی مسیحا کو اپنا سر کھجانے کے لیے کسی نہ کسی مریض ہی کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ مجھے سکول میں داخلہ ملا تو اس ارادے سے کہ بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا، ڈرائنگ کی کلاس میں جا گھسا۔ وہاں استاد صاحب وہ تمام سامانِ حرب وضرب لکھوا رہے تھے جو مغل بادشاہ جنگ اور امن دونوں زمانوں میں استعمال کیا کرتے تھے۔

کلاس میں بیٹھتے ہی میں نے انجینئر کے پنجابی ترجمے پر غور کیا تو اپنی نظر میں ایک عدد مستری ٹھہرا۔ میں نے اسی وقت دو انگلیوں کی وکٹری بنا کر ہاتھ کھڑا کر دیا۔ ماسٹر صاحب نے سخن فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے باہر نکلنے کی اجازت دے دی۔ چھٹی ہوئی تو میں ڈاکٹر بننے کے ارمان لیے ایک ایسے بک ڈپو میں جا پہنچا، جس کا مالک اپنی روزی کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے خود کسی جاسوسی ناول سے اپنا منہ سفید کر رہا تھا۔ میں نے بھاری بھرکم مالک کو بڑی مشکل سے کھینچ کر ہیرو اور ہیروئن کے غیر شرعی تعلقات کی دلدل

سے نکال کر ہائجین فزیالوجی کی کتاب طلب کی تو وہ تہاری و جباری وقدوسی و جبروت جیسے چاروں عناصر کی مدد لیتے ہوئے بولا: ''کیا ایسی چیزیں خریدی جاتی ہیں؟ تم نے میرے مطالعے میں خلل ڈال کر جو مجھے صدمہ پہنچایا ہے، اسے تو میں روزِ قیامت تک التوا میں ڈالتا ہوں۔ اب تمہاری یہی سزا ہے کہ میری دکان میں، جہاں یہ کتاب تنہائی کا دکھ سہ رہی ہے، اسے تلاش کرو اور مجھ سے ہم کلام ہوئے بغیر چلے جاؤ''۔ بالآخر تمام کتابوں کی گرد کے عوض مجھے ہائجین فزیالوجی کی کتاب مل ہی گئی۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنا تھا کہ میں اس قدر شکی مزاج ہوگیا کہ اگر کوئی مکھی بھی میرے پانی کے گلاس پر بیٹھ جاتی تو میں محکمہ کارپوریشن کو ٹیلی فون کر دیتا۔ یہ اسی کتاب کا کرشمہ تھا کہ میرے اور گھر والوں کے تعلقات پر کشیدہ کاری اور پچی کاری ہونے لگی۔ یہی نہیں بلکہ ہر ہومل اور ریڑھی والا میری آنکھ کے تل میں تیسری دنیا کا تیسرے درجے کا شخص بن کر کھٹکنے لگا۔ اُردو، اسلامیات، مطالعہ پاکستان اور ہائجین فزیالوجی تو میں قوتِ ارادی سے پڑھ لیتا مگر جونہی ریاضی کی باری آتی، اسے میں اختیاری سمجھ کر کسی مناسب وقت پر ٹال دیتا۔ آخر میٹرک کے سالانہ امتحان میں ریاضی کے پرچے والے دن اس کی باری آئی۔ میں ریاضی پر قابو پانے کے لیے بزرگوں سے سیکھی ہوئی تمام دعاؤں کا سہارا لیا کرتا تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ ریاضی کے لیے کم از کم کسی ریاض یا پھر الریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال میں نے دو ایک گھنٹے میں فیثا غورث کے مسائل پر غور کیا۔ پھر بقیان کی شکل جیسے الجبرے کی تقسیم کے سوالات حل کیے۔ جرابوں کی شکل جیسی دو چار مشقیں اور کیں۔ آہنی کھڑکیوں کے ڈیزائن سے مشابہ ضرب کے سوالات پر ایک اُڑتی سی نظر ڈال کر اپنے آپ کو یہ شعر سنا کر تسلی دے ڈالی ؎

باطل سے دبنے والے اے آسماں! نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

آخرِ کار ریاضی کا پرچہ تکے لگا لگا کر حل کیا۔ رزلٹ آیا تو فزکس، کیمسٹری اور ریاضی کی بدولت میرے اور بورڈ میں اوّل آنے والے لڑکے کے درمیان صرف ساڑھے تین سو نمبروں کی خلیج حائل تھی۔ گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ ہمارا لختِ جگر ایف۔ ایس سی میں صرف فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی پر اپنی جسمانی، روحانی اور شیطانی طاقتیں صرف کر کے بورڈ کے سابقہ ریکارڈز کچے گھڑے سمجھ کر توڑ دے گا۔ سکول میں یہ مضامین داغ دہلوی کی زبان میں تھے۔ کالج میں یہ انگریزوں کے داغ نہاں کی صورت میں میرے سامنے آئے۔ پہلے چھ ماہ تو ان داغوں کا مجھ پر ادرک کھا کر بھی ادراک نہ ہوا۔ بہر حال ایف۔ ایس سی کی تیاری کی۔ ہر پرچے میں سوا تین تین گھنٹے بیٹھا۔ نوے دن بعد رزلٹ آیا تو میں ڈاکٹر کیا ڈنگر ڈاکٹر بننے کے قابل بھی نہ تھا۔ ایف ایس سی کے بعد کئی روز تک ریلوے ٹائم ٹیبل میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ کئی دن تک میں مینارِ پاکستان اور بادشاہی مسجد کے میناروں کی اونچائی میں فرق نکالتا رہا۔ جب یہ تمام حربے نظریۂ پاکستان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے تو میں نے اکبر الہ آبادی کے انتباہ سے خوف زدہ ہو کر فوراً ایم۔ اے کر کے اپنے آپ کو گاما زبی۔ اے کی صف سے نکالا۔ قبل اس کے کہ آپ میرے بارے میں کوئی ایسا مُقفّیٰ مسجّع قسم کا تصوراتی خاکہ قائم کر لیں، جس سے لوگ آپ کی معلومات پر خواہ مخواہ انگلیاں اٹھاتے پھریں، میں خود ہی اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔

میرا قد پانچ فٹ پانچ انچ ہے۔ چلنے میں سبک رفتار اور وزن میں ہلکا ہوں۔ خاصا پورٹ ایبل ہوں۔ لفٹ لینے کے لیے انگوٹھا نمائی نہیں کرنا پڑتی۔ جسامت ایسی ہے کہ ہر کوئی یہی توقع کرتا ہے کہ سلام میں پہل میں ہی کروں۔ لیٹ کر پڑھنے کے باوجود آنکھوں کی تعداد نہیں بڑھی۔ سر کے بال کتے سے زیادہ وفادار ہیں۔ سر کے چند بال سفید

ہوئے ہیں بلکہ کیے ہیں۔ وہ بھی سیاہ بالوں کی ناقدری دیکھ کر۔ ناک اتنی مناسب کہ پانی پیتے ہوئے اسے ہاتھ سے اٹھانا نہیں پڑتا۔ میرا گلا اتنا سمارٹ ہے کہ میرا بچہ بھی اسے کلائی سمجھ کر بڑی آسانی سے اپنی انگلیوں کا کڑا پہنا سکتا ہے۔ گلے کی ہڈی اتنی مناسب ہے کہ ہر ٹائی میں ناٹ کا کام دے جاتی ہے۔ شاعروں میں غالبؔ کے بعد صرف اکبر۔ شوہروں میں اپنا آپ اور شہروں میں لاہور پسند ہے۔ آپ اگر مجھ سے یہ پوچھیں کہ میں نے مزاح کیوں لکھا ہے تو میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ میں ایک بہت بڑا سرجن ہوں اور معاشرے کا آپریشن میرے ذمے ہے۔ یہ کام تو باوردی مزاح نگاروں کا ہے۔ میرا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ میری ان تحریروں سے ہنس ہنس کر آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ اگر آپ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ اس کتاب کی بجائے لطیفوں کی کوئی کتاب خرید کر پڑھ لیں اور اگر پھر بھی تشنہ کامی کا احساس ہو تو کسی لکی یا ان لکی ایرانی سرکس کے باہر جا کر کھڑے ہو جائیں۔ وہاں کچھ لوگ اپنے پاجامے کی لاسٹک کو کھینچ کھینچ کر اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔ آپ بھی ان کے پیچھے شرافت سے ''آمین، آمین'' کہتے جائیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہماری سڑکیں ہی ناہموار ہیں بلکہ ہمارے معاشرے میں ناہمواریوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ میں نے ان ناہمواریوں کے دروازے پر ہولے سے دستک دینے کی کوشش کی ہے۔ دنیا میں کون ہوگا، جو دکھی نہیں مگر اپنے دکھوں پر روتے رہنا، ماتم کرنا اور آہ و بکا کرنا زندگی کے صاف شفاف مناظر کو دھندلا دیتا ہے۔ پھر جس آنکھ میں ہر وقت آنسو بھرے رہیں، اسے ہر چیز دھندلی، مٹی مٹی اور بجھی بجھی سی لگتی ہے۔ خدا نے جب ہماری آنکھوں کو بصارت جیسی نعمت سے عبارت کیا ہے تو کیوں نہ ہم انھیں کائنات کے وسیع و عریض حُسن کے مطالعے اور مشاہدے پر صرف

کریں۔

بعض کتابوں کا ایک ہی ایڈیشن مصنف کی پوری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہمارے معاشرے میں یہ المیہ کسی کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ آپ کی محبت نے یہ بات بھی غلط ثابت کر دی ہے۔ سیاست اور ظرافت میں کوئی تیر آخری نہیں ہوتا، اس لیے میں نے اس کتاب کے نئے ایڈیشن کے لیے کڑی نظرِ ثانی کی ہے۔ میں جس تخلیقی عمل سے گزر رہا ہوں، اُمید ہے آپ بھی نئے ذائقے سے ہمکنار ہوں گے۔ پروفیسر سیف اللہ خالد صحیح المذاق دوست ہیں، ان کی تنقید اور مشوروں کا میں سپاس گزار ہوں۔ معروف شاعر اور نقاد محترم سلیم الرحمٰن میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو اپنے مؤقر ادارے سے منظرِ عام پر لانے کا اہتمام کیا۔

تنویر حسین

ولیمہ دنگل

پچھلے دنوں ہمیں ایک رجسٹری موصول ہوئی۔ کھول کر دیکھا تو اس میں سے ایک ولیمہ کا اشتہار برآمد ہوا۔ جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔ ''بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ مؤرخہ 4 نومبر 1989ء بروز ہفتہ بمقام اکھاڑا پیر غازی شہید ایک عظیم الشان ولیمہ دنگل ہوگا، جو خواتین و حضرات بوٹیوں پر پلٹنے، جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہوں، ان کی شرکت ہمارے لیے باعثِ کروڑ مسرت ہوگی۔ ولیمہ دنگل میں شمولیت کے لیے عمر اور وقت کی کوئی قید نہیں۔ اس دنگل میں گوجرانوالہ، سیالکوٹ، وزیرآباد، قصور اور شکر گڑھ کی روسٹ مرغ کھانے والی، ثابت کوفتے نگلنے والی، سالم بکرے ہڑپ کرنے والی، دہی کے کونڈے اور پانی کے ڈرم پینے والی مشہور و معروف ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں۔''

نیز اس دنگل میں چھوٹے چھوٹے مقابلے بھی ہوں گے۔ جو شوربہ پینے والوں، زردہ اور چٹنی سلاد کھانے والوں کے درمیان ہوں گے۔ ولیمہ دنگل کے سرپرستِ اعلیٰ ''جی بھر چکا'' صاحب اور ریفری جناب دولہا میاں صاحب ''چپ شاہ'' ہوں گے۔

ہم 4 نومبر کو ریشمی دھوتی کرتا زیبِ تن کر کے اور گلے میں ایک عدد تعویذ لٹکا کر اکھاڑا پیر غازی شہید کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو قناتوں اور سائبانوں تلے نائی

دیگوں میں کف گیر ہلا ہلا کر مہمان ٹیموں کا استقبال کر رہے تھے۔ شادی والے اکھاڑے میں ڈھولک اور ڈھول کی آوازوں سے اگرچہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے مگر ولیمہ دنگل کی رونق اور گہما گہمی میں ہر لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ دیگوں، کڑاہیوں، کف گیروں اور ڈھولک کے ملے جلے پکے راگوں اور پاپ میوزک سے دیگوں کے اندر مرغے مرغیوں اور بکرے بکریوں کی فنا کا رقص جاری تھا۔

جب دیگیں پک کر تیار ہو گئیں تو ریفری چپ شاہ نے سیٹی بجاتے ہوئے اعلان کیا۔ ''خواتین وحضرات! ولیمہ دنگل کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ اپنے اپنے دانت تیز کر لیں۔ جو ٹیم زیادہ کھانے میں نمبر لے جائے گی، اس کے لیے سٹریچروں اور چارپائیوں کا انتظام کر دیا گیا ہے تاکہ اسے فرسٹ ایڈ کے ساتھ ساتھ ہسپتال بھی پہنچایا جا سکے۔ یہ اعلان سنتے ہی بچوں، بوڑھوں اور جوانوں نے اپنے اپنے کُرتے اتار دیے اور دھوتیوں، شلواروں اور پتلونوں کے لنگوٹے کس کر کھانے پر جھپٹ پڑے۔ پہلے تو ٹیموں نے اپنے آپ کو گرم گرم گوشت کی بھاپ سے ''وارم اپ'' کیا اور پھر کف گیروں، چمچوں اور چھری کانٹوں سے گوشت کھانا شروع کر دیا۔ جب کوئی ٹیم دوسری ٹیم کو آگے نکلتا دیکھتی تو وہ کف گیروں، چمچوں اور چھری کانٹوں کو زمین پر پٹخ کر دونوں ہاتھوں سے گوشت کھانا شروع کر دیتی۔ ولیمہ دنگل کی ویڈیو فلم بھی بن رہی تھی تاکہ کل کلاں کو کوئی کھا کر مکر ہی نہ جائے۔

پہلے تو ہم گوشت خوروں کے ہجوم کے چھٹنے کے منتظر تھے۔ پھر یہ سوچ کر کہ کہیں بھوکے نہ رہ جائیں، ہم پلیٹ اور چمچ کی تلاش میں کھانے کی میز کی طرف بڑھے۔ ابھی ہم میز کے قریب پہنچے ہی تھے کہ گوجرانوالہ کے ایک منجھے ہوئے کھلاڑی نے کبڈی کبڈی

کرتے ہوئے ہماری ٹانگ پکڑ لی۔ ''یار..... فاؤل تو نہ کھیلو!'' ہم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ مرغے یا بکرے کی ٹانگ نہیں، یہ تو ہماری ٹانگ ہے''۔ خیر وہ ہماری ٹانگ چھوڑ کر اپنے اصل ہدف یعنی اصل مرغ کی طرف لپکا۔ ہم پھر پلیٹ اور چمچ لے کر آگے بڑھے۔ اس مرتبہ بھی ہمیں ایک صحت مند کھلاڑی نے راستے ہی میں روک لیا۔ اب تو گھمسان کا رن پڑ چکا تھا۔ بڑے بڑے گوشت خور گوشت کی ڈشوں کو راستے ہی میں ہائی جیک کر لیتے اور ہم جیسے اناڑی ان کا منہ ہی دیکھتے رہ جاتے۔ کھانے والوں کے درمیان مقابلے کا ٹیمپو بہت تیز ہو چکا تھا اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کون کس کی ڈش میں کھا رہا ہے اور کون کس کے منہ میں ڈال رہا ہے؟ ہم یہ سوچ کر پیچھے ہٹ گئے کہ اگر موقع ملا تو چھوٹے مقابلوں میں حصہ لیں گے۔

کھانے کے دوران میں کھلاڑیوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیے تھے۔ جن چہروں پر کیل، چھائیاں، مہاسے اور چیچک کے دانے تھے وہ دہی، چٹنی اور سلاد سے پُر ہو چکے تھے۔ تمام کھلاڑیوں کے سر، منہ اور ہاتھ شوربے سے لت پت تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ ابھی ابھی شوربے کی دیگوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ اس اثناء میں بہت سے کھلاڑی بے ہوش ہو ہو کر گرنے لگے۔

اب ریفری نے شوربہ پینے والوں، زردہ اور چٹنی سلاد کھانے والوں کو دعوت دی کہ وہ میدان میں آ کر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ کھلاڑیوں نے آن کی آن میں رکوع کی شکل میں اپنے اپنے منہ دہی کے کونڈوں میں ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ چٹنی کے ڈونگے اور سلاد بکریوں کی طرح کرچ کرچ کر کے کھانے لگے۔ ہم نے اس مرتبہ بھی اپنی قسمت آزمانا چاہی مگر ہماری چنے یا ماش کی دال نہ گل سکی۔ اس مقابلے میں بھی بہت سے

کھلاڑی بے ہوش ہوئے مگر انھیں فوراً ایمبولینس کے ذریعے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ولیمہ دنگل کے اختتام پر ریفری ''چُپ شاہ'' نے ڈائس پر آ کر سب ٹیموں کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور اوّل دوم اور سوم آنے والی ٹیموں کو انعامات دینے کا اعلان کیا۔

لاہوری ناشتے

لاہوری ناشتوں میں حلوہ پوری کا وہی مقام ہے جو اُردو ادب میں مُلا وجہی کی ''سب رس'' اور عبدالعزیز خالد کی شاعری کا ہے کیوں کہ انھیں نوشِ جاں کرنے کے بعد آدمی کی طبیعت اتنی مکدر رہو جاتی ہے کہ وہ مُقدر کا سکندر ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حلوہ پوری کی شکل وصورت پشتو فلموں کے پوسٹرز سے بھی زیادہ پُرکشش ہوتی ہے مگر اس کی سیرت پیٹ میں اتنی پیچیدگیاں اور اُلجھنیں پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی کے منہ سے ''الحمدللہ'' کے الفاظ نہیں نکلتے بلکہ اس کی پاکٹوں سے انٹاسڈ اور کارمینا کی گولیاں نکلتی ہیں۔ بہرحال حلوہ پوری کے تیار ہونے کا عمل ہماری حکومتوں کے تبدیل ہونے کے عمل کی طرح بڑا ''تھرلنگ'' ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مردِ کامل اپنی کمر کے گرد جہاندیدہ سرد وگرم چشیدہ چارگرہ سی دھوتی لپیٹے میدے کے سفید سفید پیڑوں کے نرم ولطیف جذبات کو اپنے کالے ہاتھوں سے ''پھینٹی'' لگا لگا کر ٹھیس پہنچا رہا ہوتا ہے۔ مردِ کامل کے ہاتھوں کی کڑک اور دھمک اہلِ محلّہ کو اتنا جذباتی بنا دیتی ہے کہ انھیں گھر سے نکلتے ہوئے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ انھوں نے کیا پہنا ہوا ہے۔ مثلاً کسی نے صرف پاجامہ پہن رکھا ہوتا ہے اور کسی نے صرف کُرتا۔ کوئی ٹریک سوٹ پہنے ''مسٹر پاکستان'' بنے چلا آ رہا ہے اور کوئی نیکر اور بنیان میں اپنی ٹانگوں اور سینے کا تعارف کرا رہا ہوتا ہے۔

وہ اکناکمس کی بھی اتنی سوجھ بوجھ رکھتا ہے کہ وہ خریداروں کی جیبیں ڈھیلی کروانے کے لیے کبھی کندھے ہلا کر اور کبھی ٹھمکا لگا کر پیڑے کو ہوا میں یوں چھوڑ دیتا ہے کہ قریب کھڑے لوگ یوں محسوس کرتے ہیں، جیسے یہ پُوری انہی کے رخساروں پر شرم وحیا کی سرخی اور گرمی سے ہی پک کر تیار ہوگی۔ تاہم یہ بڑی اونچائی سے گھومتی ہوئی کڑاہی میں جا گرتی ہے اور فوراً اپنی اوقات سے باہر ہوتے ہوئے کسی بزنس مین کی طرح پھول جاتی ہے اور کسی جاگیردار کی مانند سرخ ہوجاتی ہے۔ دُکان دار کے آگے گاہکوں نے یوں ہاتھ پھیلائے ہوتے ہیں، جیسے وہ دُکان دار کے عقیقے پر ''پہلی عقیقہ ٹو یو'' کہنے کی تیاریاں کررہے ہوں۔ کچھ باادب بانصیب قسم کے لوگ جھولیاں اور تھیلے بھر بھر کے حلوہ پُوریاں لے جاتے ہیں اور کچھ بے ادب بے نصیب قسم کے لوگ ایک پوری پر دکاندار کے کف گیر سے حلوے کے آٹوگراف ہی لیتے جاتے ہیں۔

لاہور میں علی الصبح ناشتے کا بازار گرم ہوجاتا ہے یعنی ناشتے والی دکانوں میں ہر پتیلے کے نیچے سوئی گیس یا کوئلے کے شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگوں کے جمِ غفیر کو دیکھ کر دُکان دار کا کف گیر بہت تیزی سے چلنے لگتا ہے۔ ان چہروں میں کوئی چہرہ ایسا نہیں، جس کے سر پر بکرے کی سری کی دُھن، پاؤں میں بکرے کے پایوں کی تمکنت اور رخساروں پر بکرے کے رخساروں کی لگن سوار نہ ہو۔ ہر گاہک کا ڈونگا ''ھل من مزید'' کی منہ کھولتی تصویر نظر آتا ہے۔

پیٹ کے اس معرکے میں بکرے کے وہی اعضاء بروئے کار لائے جاتے ہیں، جو معدے میں پہنچ کر ہلچل مچا دیں۔ جنگلی انسان اور آج کے مہذب انسان میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر پتھر مار کر جانوروں کا شکار کرتا تھا اور مؤخر الذکر پیسہ مار کر جانوروں کے

سپئیر پارٹس شکار کرتا ہے۔ چینی کہاوت ہے کہ صبح کسی سے چھین کر بھی کھالو، دوپہر کو اپنے حصے کا کھاؤ اور رات کو اپنے حصے کا بھی کسی کو دے دو۔ ہمارے ہاں چینی کہاوت پر کم اور چینی کے پیالوں پر زیادہ عمل کیا جاتا ہے۔ زندہ دلانِ لاہور کی رائے ہے کہ زندگی میں ناشتے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ناشتہ ایسا نہ ہو کہ دو قدم چلنے کے بعد ہضم ہو جائے بلکہ ناشتہ ایسا ہو کہ ایک تو پیٹ میں کوئی خلا باقی نہ رہ جائے، دوسرے، جسم پر سارا دن نشہ، غنودگی اور سوز و مستی طاری رہے۔

ترے سارے بکروں کی سریوں کی خیر
''لہوروں'' کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو ''ان'' کا جگر بخش دے
اگر یہ نہیں تو کمر بخش دے

لاہور کا ایک مشہور و مقبول ناشتہ ''نان چنے'' ہے۔ لاہور کے چپے چپے پر نان چنوں کی ریڑھیاں اور دکانیں دیکھ کر یوں لگتا ہے، جیسے حضرات آدم کو تو گندم کی پاداش میں جنت سے نکال کر دنیا میں آباد کیا گیا تھا جب کہ اولادِ آدم کو چنے کھانے کے لیے لاہور بھیج دیا گیا تھا۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، ہم نے لاہوریوں کی قسمت کے پتیلے چنوں ہی سے بھرے دیکھے ہیں۔ اہلِ لاہور چنوں کی محبت میں اس حد تک گرفتار ہیں کہ ان کا کوئی ڈکار بھی چنوں سے خالی نہیں ہوتا۔ امراضِ معدہ کی بہت سی معجونوں کی فروخت کا دارومدار ہی نان چنوں پر ہے اور بعض حضرات انھی خوش ذائقہ اور لذیذ معجونوں کی وجہ سے نان چنے کے ناشتے کا ناغہ نہیں کرتے۔ یہی نہیں، بہت سے لوگ پیچش کا علاج بھی نان چنوں ہی سے کرتے ہیں۔

جس طرح لکشمی چوک پر واقع سینماؤں سے فلموں کے شو ٹوٹتے ہیں، اسی طرح روزانہ نان چنوں کے بھی شو ٹوٹتے ہیں۔ ایک روز ہم نے ایک چنا اسپیشلسٹ سے استفسار کیا کہ بھئی! لاہور میں جگہ جگہ سفید چنے ہی پکائے جاتے ہیں، کالے چنے کیوں نہیں؟ گورے کالے میں یہ تمیز کیسی؟ اس نے جواب دیا کہ کچھ مرتبہ حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی کو مٹانا پڑتا ہے۔ کالے چنے یا تو پریشر ککر میں گلتے ہیں یا گھوڑوں کے معدے میں۔ آپ آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ کالے چنے دانتوں کے لیے حزبِ اختلاف کا رول ادا کرتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ سفید چنوں سے دانتوں کو تو آسانی رہتی ہے لیکن ان سے خون بھی تو سفید ہوسکتا ہے۔

چنے عجیب جنس ہیں۔ کچے ہوں تو منافع کم دیتے ہیں جب کہ پتیلے میں پک کر ان کی آپس میں شادیاں ہوجاتی ہیں اور کف گیر ہلانے سے ان کی تعداد ''چگنی'' ہوجاتی ہے۔ ریڑھیوں پر آپ نے چنوں کے پتیلے کے ساتھ ایک مرغیوں کا ڈربہ سا بھی ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ اس میں نانوں کو صبح دم ہی نظر بند کردیا جاتا ہے۔ ریڑھی بان کے اعصاب پر ایک عدد ڈسٹر بھی سوار ہوتا ہے۔ گاہک اس سے اپنی مونچھوں میں پھنسے ہوئے چنے نکالتے ہیں اور ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ہر نئے گاہک کی پلیٹ بھی اسی سے صاف ہوتی ہے۔ اگر ڈسٹر میسر نہ ہو تو ریڑھی بان اپنی قمیص کا دامن ہی پلیٹ میں پھیر لیتا ہے۔ بیماری کے اصولوں کے عین مطابق پلیٹیں دھونے کا ایسا آٹومیٹک نظام شاید ہی روئے زمین پر کہیں رائج ہو۔ ایک زنگ آلودہ بالٹی، جو پانی کے حمام تلے لٹک رہی ہوتی ہے، اس میں گاہک باری باری وضو کرنے کے بہانے اسی کے اندر والی پلیٹوں کو خود بخود صاف کرتے جاتے ہیں۔

لاہور کے ''چکڑ چھولے'' یا ''گارا چھولے'' بہت مشہور ہیں۔ جنہوں نے زندگی

میں کبھی یہ ڈش نہیں دیکھی، وہ اسے بارش کے بعد ہونے والی گارے یا چکڑ قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہوں گے۔ شروع شروع میں ہم بھی اسے پھسلنے والی چیز ہی سمجھتے تھے اور جب ہم نے اسے پہلی بار اپنے دسترخوان کی زینت بنایا تو ''چکڑ چھولے'' اور عام چکڑ میں ایک ایسی قدرِ مشترک موجود تھی، جس کی بنا پر ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔

لاہوری ناشتوں میں ایک ناشتہ آلوؤں والے پراٹھوں کا بھی ہے، جس کے بارے میں شاعر عرض کر چکا ہے۔

رناں والیاں دے پکن پروٹھے تے چھڑیاں دی اگ نہ بلے

ہمارا مزدور طبقہ روز روز آلوؤں والے پراٹھے کھا کر معدے کی گرانی کا ایک نیا باب رقم کر رہا ہے۔ آلوؤں کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ گول، بیضوی، لمبوترا، چپٹا بیضوی اور بے شکلا۔ آلو ہر طرف گھوم جاتا ہے اور بے پیندا ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ کسی دور میں ایک عوامی لیڈر ایک ریٹائرڈ ہوائی لیڈر کو اپنے جلسوں میں آلو کہہ کر پکارتے بلکہ اپنے ہاتھوں کی ڈیمانسٹریشن سے آلو کی مختلف شکلیں بناتے تھے۔ امریکا ہر سال وافر آلوؤں کے حساب سے سمندر میں پھینکتا ہے، تاکہ کوئی غریب ملک ان کے اسلحے کی طرح آلو بھی مفت نہ کھا سکے۔ اسی طرح وافر کتابیں بھی امریکا میں سمندر بُرد کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں ہر چیز چوں کہ امریکا سے لی جاتی ہے، اس لیے کتاب اور آلو کی پالیسی بھی وہیں سے آئی ہے۔ پاکستان میں ہر چیز کو اُلٹا دیا جاتا ہے، اس لیے کتاب سے زیادہ آلو قابلِ قدر ہے بلکہ ہم تو ہر وقت امریکا سے کہتے رہتے ہیں۔ ہمیں، آ۔لو۔ اس رعایتِ لفظی کے ساتھ حسنِ طلب بھی موجود ہے۔

آلو ایک ایسی شیم پروف اور واٹر پروف قسم کی صنف ہے کہ اس کا استحصال یا

احتساب کسی شکل اور کسی طرح بھی کرلیا جائے، یہ اُف تک نہیں کرتا اور اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کسی زمانے میں آلو ''ٹکے ٹوکری'' ہوا کرتے تھے۔ اس وقت بچے اور بڑے آلو بھون بھون کر کھاتے تھے، اس وقت آلوؤں میں ذائقہ ہوتا تھا یا زبان میں۔ کسی ایک میں ہوتا ضرور تھا۔ آلوؤں کو اپنے کرم فرماؤں سے یہ شکایت تھی کہ انھیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ انھیں ''مٹی کا مادھو'' کہا جاتا ہے۔ بالآخر آلوؤں کو اپنی پھیکی ذات کا ادراک ہوا اور انھوں نے نایاب ہو کر اپنی مارکیٹ ویلیو اتنی بڑھالی کہ لوگ سیب پکانے کے بارے میں غور کرنے لگے۔ ان کی شان دیکھیے کہ مٹی سے نکل کر چپس کی اَن گِنت اشکال میں منہ مانگے داموں بکتے ہیں۔ جس طرح پھلوں میں مٹھاس اور ذائقے کی وجہ سے آم کو خاص مقام حاصل ہے، اسی طرح سبزیوں میں بے ذائقہ اور مہنگا ہونے کی وجہ سے آلوؤں کو ایک اعلیٰ رُتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ ہماری فلموں میں ہیرو ایک ہی رہتا ہے، جب کہ اس کے ساتھ ہیروئنیں بار بار بدلتی ہیں۔ ہمارے نوجوان سال بھر جین کی ایک ہی پتلون بار بار پہنتے ہیں لیکن اس کے ساتھ صرف قمیصیں بدلتے ہیں، اسی طرح ہمارے گھروں کا المیہ بھی یہ ہے کہ آلو پتی کا کام دیتے ہیں یعنی بلاناغہ پکائے جاتے ہیں، جب کہ ان کے ساتھ صرف سبزیاں بدلتی ہیں۔ جن حضرات کے خون کا گروپ او۔ پازیٹو تھا، ان کا اب آلو پازیٹو ہو چکا ہوگا۔ گھر میں آلو گوشت پک جائیں تو پھر یہ ٹکیوں، پراٹھوں اور بھرتوں سے ہوتے ہوئے اس وقت تک گھر سے نہیں نکلتے، جب تک تمام افرادِ خانہ کو ''آلو۔ پائزننگ'' نہ ہو جائے۔

لاہوری ناشتوں میں ایک ناشتہ ڈبل روٹی، بند، جام اور مکھن کا ناشتہ ہے۔ ڈبل روٹی تو دراصل ان کلرک بادشاہوں کا ناشتہ ہے، جنھیں حقیقت میں سنگل روٹی بھی

میسر نہیں۔ پھر بھی کلرک بادشاہوں کی زندہ دلی دیکھئے کہ وہ اکبرالہ آبادی کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر چار دن کی زندگی کو کوفت نہیں سمجھتے بلکہ بی۔اے کرتے ہیں، ڈبل روٹی کھاتے ہیں اور پھر اپنے سامنے فائلوں کی پہاڑی سجا کر سائلوں کو ڈراتے اور ٹرخاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ بیٹھ کر خوشی اور گیس سے پھول جاتے ہیں۔ جہاں تک بند مکھن کے ناشتہ کا تعلق ہے، اس کی مقبولیت کی تو انتہا نہیں۔ ہمارے ہاں ہر شخص مکھن لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یعنی ہر شخص صاحبِ اسلوب ہے۔ کبھی مکھن صرف بی پی، میری گولڈ، راوی اور ڈونا وغیرہ کے بندوں کو لگایا جاتا تھا، مگر اب یہ مکھن خدا کے صرف ان بندوں کو لگایا جاتا ہے، جو اربابِ بست و کشاد ہوں، وزیر ہوں، مشیر ہوں یا افسران ہوں۔ غرض ہمارے ہاں مکھن لگانے کا فن ارتقائی منازل طے کرتے کرتے ''فنونِ لطیفہ'' میں شمار ہونے لگا ہے۔

اپنا تو بن!

اگر کوئی ہمیں دبلے اور موٹے آدمی میں فرق پوچھے تو ہم بغیر کسی تمہید کے کہہ دیں گے کہ ان میں وہی فرق ہے، جو ایک سرد و گرم چشیدہ پہلوان اور اس کے نوخیز پٹھے میں ہوتا ہے۔ پٹھا ہارے یا جیتے، دونوں صورتوں میں کریڈٹ یا ڈس کریڈٹ استاد پہلوان ہی کو جائے گا۔ بچے عموماً موٹے شخص کو دیکھ کر ہاتھی کا بچہ کہہ اٹھتے ہیں۔ یہ کوئی نادر روایات نہیں بلکہ بزرگوں کے اقوالِ زریں کے مطابق بچے نہایت سچے ہوتے ہیں۔ انھی خطوط پر ہمیں یہ سچ عین حق نظر آیا اور مزید انکشاف ہوا کہ آدمی کا ہاتھی سے منسوب ہونا کھی یا مچھر کے ساتھ بریکٹ ہونے سے تو بدرجہا بہتر ہے۔ سنا ہے کہ لکھنؤ میں جہاں ہانکے شعراء کی کثرت تھی، اس فضا میں دلّی سے آنے والے بھاری بھرکم شعراء بھی چھیلے چھبیلے بن گئے تھے۔ استاد امام بخش ناسخ نے اپنی ہیئت اور جون کو دوامی حیثیت بخشنے کا مصمّم ارادہ کرلیا۔ موصوف شاعر کہلوانے سے قبل جس طرح جسمانی کثرت فرمایا کرتے تھے اور اپنے تن و توش سے جس خلوص سے محبت کیا کرتے تھے، شاعری کے میدان میں اترنے کے بعد بے چاری شاعری کا دھوبی پٹڑا کرنے سے باز نہ آئے۔ وہ ایک اعتبار سے ''دو مونہے'' کہلا سکتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ آتش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پنجہ آزمائی فرماتے تھے۔ دوسری جانب، وہ دبستانِ دلّی کا کچومر نکالنے میں ہمہ تن منہمک رہتے تھے۔

موٹے آدمی کو بعض لوگ دریائی گھوڑا یا فارز (بتر جمہ پنجابی) بھی کہتے ہیں.....

ہر قسم کا حرام ہے صاحب کے پیٹ میں
ساری غلاظتوں کا یہ گویا گودام ہے

غرض موٹے آدمی کی سوانح عمری اچھے خاصے سانحوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وہ بچپن ہی سے کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے ہوتے ہیں۔ یہ انھی کے خلوص اور نیک نیتی کا نتیجہ ہے کہ بہت سی اشیائے خوردنی پر زرِ مبادلہ ضائع کرنا پڑتا ہے۔ ان آدمیوں کی زندگی کے قیمتی ماہ و سال سال گروں میں کیکوں کے سومنات فتح کرنے، ولیموں میں بوٹیوں کے مینارِ پاکستان بنانے، عقیقوں میں بوٹیوں کی تلاش میں آلو کھانے اور چہلموں میں قورمے اور مترگوشت کے انتظار میں چہل قدمی اور مترگشت کرنے میں گزرتے ہیں۔

یہ حضرات نور کے تڑکے نباتات اور جمادات تک کو چیلنج کرتے دکھائی دیتے ہیں، وہ اشیائے خوردنی اور "نوشی" جنھیں ایک باشعور اور خوش ذوق آدمی دیکھ کر غش ہی کھا جائے، ان کے لیے زندگی بخش نعموں کا پیغام لاتی ہیں۔ مثلاً لاہور کے گلے کوچوں سے گزرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ دیگوں اور دیگچوں کے اندر سے بکرے، مرغے، بیل اور بھینسے اپنی اپنی زبانوں، بونگوں، رانوں اور کولہوں سے فریاد کرتے نظر آرہے ہیں۔ چوں کہ انسان بھی گوشت پوست کا مرقع ہے، اس لیے، ان کی جسمانی مجبوریوں پر اس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہم نے خود ایک عرصہ جملہ جانوروں پر منہ مارا ہے اور اب ہمارے معدے نے اپنے اوپر ایک مستقل مختی لگا چھوڑی ہے۔ برادرِ عزیز! "یہ شارع عام نہیں، حیوانات کا گزر ممنوع ہے۔"

گھر سے باہر ناشتہ اور لنچ کرنے والوں کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ یا تو یہ

نو واردانِ شہر ہیں یا ان کی بیویاں پھوہڑ۔ اگر ناشتے میں چھ سات نان، ایک ڈونگا سری پائے + زبان اور کھد۔ ایک پیالہ دہی، آدھ کلو حلوہ اور دس بارہ پُوریاں بچھی ہوں تو بندہ کسی جگہ بچھ تو سکتا ہے، کام پر نہیں جاسکتا۔ ہم جیسے موم کے پُتلے اگر اس نوعیت کے ناشتہ کے قریب سے بھی گزر جائیں تو کبھی گھر نہ پہنچیں۔ اس قسم کا ناشتہ کرنا، بل ادا کرنا اور پھر اسے دوپہر کے کھانے تک اٹھائے پھرنا......

انھی کا کام ہے کہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

موٹے لوگوں کے بارے میں پتلے لوگوں نے اُڑا رکھی ہے کہ ان کا دماغ بھی موٹا ہوتا ہے۔ حالاں کہ تربوز کے گرین ہیلمٹ کے اندر کا خلاء نہایت محدود ہوتا ہے۔ یہ بکرے کی سری اس لیے کھاتے ہیں کہ ایک تو ان کا سر صدقہ نکل جائے۔ دوسرے، ان کی سرداری اور سرتاجی سلامت رہے۔ تیسرے، انھیں انڈین ایکٹرس سری دیوی کے درشن کی حسرت ہی نہ رہے۔ اس سے یہ خدشہ بھی بہر حال اپنی جگہ موجود رہتا ہے کہ اسی مخلوق میں سے بعض یا اکثر تیز اور تُرش مزاج ہستیاں آگے چل کر اسمبلیوں میں ایک دوسرے کا سر کھائیں گی اور یہ چٹ پٹا اور مصالحے دار فیضان بالواسطہ قوم تک بالترتیب پہنچے گا۔ موٹا آدمی چوں کہ اپنے جسم اور حجامت کے حساب سے "شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً لوٹے" کے قریب تر ہوتا ہے، اس لیے اسے دکان سے گھر تک اور پھر بیت الخلاء......

(یہ جگہ اس لیے چھوڑی ہے کہ ایسا خلاء عمر بھر پُر ہونے میں نہیں آتا) تک پہنچنے میں آسانی رہے۔ موٹے لوگوں کے خورد و نوش کی بات چلی ہے تو وہ بکروں یا بکریوں کی زبانیں اس لیے کھاتے ہیں کہ ان کی زبانیں بکروں اور بکریوں کی طرح معصوم، سچی، صاف اور سفید ہوں۔ وہ الگ بات ہے کہ بعض لاہوریوں کی زبانیں اتنی صاف نہیں۔ وہ

''ر'' کی بجائے ''ڑ'' اور بعض اوقات اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے ایسی زبان بولتے ہیں، جو کسی گندھارا تہذیب سے مُطہر ہو کر آئی ہو۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں کیوں کہ یہ قصور ان قصائیوں کا ہے جو کبھی کبھار انھیں میدانی اور ریتلے بکروں کے بجائے پہاڑی اور ٹیڈی بکرے کھلا دیتے ہیں۔

موٹے لوگ پائے اس لیے کھاتے ہیں کہ انھیں کوئی مذاق سے چوپائے بھی کہ لے تو وہ چپ چاپ اور ہنسی خوشی برداشت کر سکیں۔ پھر یہ پائے بڑے کثیر المقاصد ہوتے ہیں۔ پائے کھا کر آدمی بڑے پائے کا آدمی کہلاتا ہے۔ پائے کھانے والے لوگ اتنے مستقل مزاج ہو جاتے ہیں کہ ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔ بس ان پائیوں کا ایک ہی نقصان ہے کہ ناغہ کے روز اس کے عادی آدمی اپنی بیگمات سے چارپائی کے پائے ہی کھاتے ہیں!

ان کا ایک اور من بھاتا کھاجا ''اوجھڑی'' ہے۔ حکماء کمزور معدے والوں کو اس کے استعمال کا خصوصاً حکم دیتے ہیں۔ موٹے لوگوں کا خیال ہے کہ جسمانی پٹھوں کو تقویت دینے کے لیے یہ بڑے کام کی چیز ہے کیوں کہ اس میں ''پٹھے'' بھرے ہوتے ہیں۔ پھر وہ لوگ بھی اوجھڑی کثرت سے کھاتے ہیں، جنھیں نہانے کے بعد اوجھڑی کے قبیلے سے تعلق رکھنے والی سوتی صنعت (تولیۓ) سے چنداں دلچسپی نہ ہو۔ اس طرح وہ تولیۓ کے خارجی استعمال کی بجائے اس کا داخلی استعمال کرتے ہیں۔

موٹے لوگوں کا لنچ دیکھ کر دھیان غرباء کی طرف جاتا ہے کہ ان لوگوں نے تپتی دوپہروں اور سرد ہواؤں میں زمین کاشت کر کے اناج اُگا دینا ہوتا ہے۔ پولٹری فارم کے مزدوروں نے ایک ڈیڑھ ماہ میں نوٹ سیل کے لیے مرغے کو بلوغت تک پہنچا دینا ہوتا ہے۔

گلہ بانوں نے بکروں کے ریوڑ پال دینے ہوتے ہیں، مگر ان سب کا کیا دھرا کھانے پکانے کی مختلف ترکیبوں سے خوش حالوں اور خوش خوراکوں کے سامنے آجاتا ہے، جسے وہ آنکھ بند کر کے کھا پی جاتے ہیں۔ موٹے جب دریائے خوراک میں غوطہ زن ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے، جیسے وہ زندگی کی بہت بڑی سچائی کو علامہ اقبال کے اس شعر کا کفن پہنا رہے ہوں......

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

رہا یہ سوال کہ وہ مرغے اور مرغیاں بیک وقت اپنی میز پر کیوں لٹاتے ہیں؟ وہ اس لیے کہ ایک تو وہ اپنے بچوں کو بیٹوں اور شیٹوں کے درمیان فرق بتاتے ہیں۔ دوسرے وہ مرغوں اور مرغیوں کو ذبح کرتے وقت اپنے بچوں کو علامہ اقبال کی پیاری پیاری نظموں ''بچے کی دعا''، ''ہمدردی'' اور ''پرندے کی فریاد'' ذائقے سمیت ان کے پیٹ نشین کراتے ہیں۔ گوبھی آلو اور بھنڈیاں اس لیے کھاتے ہیں کہ پٹرول اور مٹی کی آلودگی کے باعث جسم میں حرص و ہوا کی کمی واقع نہ ہو جائے۔ دہی کے کونڈے اس لیے نوش جاں کرتے ہیں کہ دوسروں کا ''کونڈا'' کرنے میں آسانی رہے۔ پھلوں کی چیر پھاڑ اس لیے کہ مسئلہ کشمیر حل ہونے سے پہلے پہلے پھل کھانے کی خوب پریکٹس ہو جائے اور سلاد تمام کھانوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر۔

موٹا آدمی لب سڑک ہاتھ جوڑ کر ہی کیوں نہ کھڑا ہو جائے، کوئی اسے لفٹ نہیں دیتا کیوں کہ گاڑی والوں کو بہر حال اپنی گاڑی کی ناموس عزیز ہوتی ہے۔ ویگن والے تو اس حد تک کاروباری ہیں کہ وہ صرف ایسی ہی سواریوں کا انتخاب کرتے ہیں، جن کے جسم اور چال چلن دونوں میں کافی لچک ہو۔ موٹا آدمی اگر رکشے میں گھسنے کی کوشش کرے تو رکشے والا کچھ یوں جواب دے گا۔ ''باؤ جی! اگر آپ کا پھیرا لگ گیا تو باقی پھیرے ورکشاپ کے ہوں گے۔''

یوں تو گھروں میں مہمانوں کو رحمتِ خداوندی سمجھا جاتا ہے مگر ہیوی ویٹ مہمانوں کو یہاں بھی دماغ پر کافی زور دے کر خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ ایسا مہمان اگر جلدی سے کسی ایسی چارپائی پر بیٹھ جائے، جو رعشہ زدہ ہو تو زنانہ سرگوشیوں کے ساتھ چارپائیانہ سسکیاں بھی کانوں میں ''رسیاں'' گھولتی ہیں۔ موٹے آدمی کی بدولت اس کے درزی اور دھوبی بھی قنوطیت کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ درزی کو ایسے آدمی کا عام لباس بھی کفن نظر آتا ہے اور دھوبی کو ایسے آدمی کے کپڑوں کے عوض حاصل ہونے والی کمائی اس کی ''شو'' ہی حل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

موٹے حضرات کی گردن دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ جیسے یہ پلتے پلتے سر پر حاوی ہونے کے چکر میں ہے۔ اس کے سینہ میں جھانکا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے سینے نے اندر اس حد تک مُشک مچایا ہے کہ وہ تعلقاتِ عامہ کے لیے سلائیاں ادھیڑ رہا ہے۔ اس کی رانوں اور کولہوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں پریشاں نظری کا لپکا ہے۔ اس کا پیٹ ایسے دکھائی دیتا ہے جیسے گنبدِ بے درغلاف میں بلکورے لے رہا ہو۔ ہم چوں کہ دانا نہیں، اس لیے یہ راز کھولتے ہیں کہ موٹاپے کے شکار لوگوں کو اپنے جسم کے اعشاری نظام کے اشارے سمجھنے چاہییں لیکن ان حضرات کے نزدیک ہم جیسے ہما شما بندوں کی کیا حیثیت ہے، انھوں نے تو حکیم الامت شاعرِ مشرق جیسے انقلابی فلسفی کی بات کب مانی، جس نے بڑی سماجت سے کہا تھا۔

اپنے ''تن'' میں ڈوب کر پا جا سراغِ ''لاغری''
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

رکشہ.....قابلِ رشک سواری

رکشہ کا لفظ کب ایجاد ہوا، اس کے بارے میں تاریخ رکشا ابھی تک خاموش ہے۔ گمان غالب ہے کہ جب رخشی یا رخشندہ وغیرہ نامی لڑکیاں اس میں سوار ہوئیں، اس دن سے اس کا نام ہی رکشہ بن گیا۔ یہاں سے اس کے مذکر اور مؤنث کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ یعنی اس میں مرد بیٹھتا تو یہ مذکر اور عورت بیٹھتی تو اس کی جنس بدل جاتی اور یہ مؤنث ہو جاتا۔ مردوں کے لیے رکشے کو ہمیشہ کٹھور پایا گیا ہے اور اس کے دل میں مردوں کے لیے نرم گوشہ نہیں پایا جاتا، لیکن عورتوں کو دیکھتے ہی اس میں ہمدردی کے نازک جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

دنیا میں پہلے رکشہ آیا تھا یا سواری۔ بہرحال حضرت آدمؑ نے جنت سے قدم باہر نکالا ہو گا، انھیں دیکھ کر سب سے پہلے رکشہ ہی لپکا ہو گا۔ اس کا بیرونی ڈھانچہ ہمارے انتظامی و سیاسی ڈھانچے سے کافی ملتا جلتا ہے یعنی یہ کس طرف سے اُلٹا ہے یا کس طرف سے سیدھا ہے۔ اسے اگر اُلٹا کر دیکھا جائے تو پھر بھی سیدھا ہی نظر آتا ہے۔ اس کی صورت اتنی عجیب اور بُری ہے کہ اس پر جو بھی نظر ڈالتا ہے، بُری ہی ڈالتا ہے۔ انسان کے دو پاؤں ہوتے ہیں اور اس کے تین یعنی یہ شیطانی چرخہ اپنی حرکتوں میں انسان سے ایک قدم آگے ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بندے کو پیدل چلتے نہیں دیکھ سکتا۔ گدھا تو مٹی

ڈھوتا ہے لیکن رکشہ مٹی کے پُتلے ڈھوتا ہے۔ یہ سرِ عام نہ صرف بچوں کو اٹھا لیتا ہے بلکہ بچوں والی کو بھی اٹھا لیتا ہے۔ کوئی عورت اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ رہی ہو تو اس کی اکلوتی آنکھ میں شرم کی بجائے تاجرانہ چمک پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے یہ اسے بحافظت اسٹیشن، لاری اڈے یا ایئرپورٹ تک پہنچا دیتا ہے۔ رکشہ ایسی چیز ہے، جو سڑک پر چلتے ہوئے اپنی آواز، دھواں اور ٹائروں کی دھول مخلوقِ خدا پر برابر چھوڑتا ہے۔ آج تک ہمیں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ملا، جو اس کے گزر جانے کے بعد اس کے حق میں کلمۂ خیر کہتا ہو۔ یہ چلا جاتا ہے تو لعنت، ملامت اور پھٹکار اس کی پھٹ پھٹ کا دور تک تعاقب کرتی ہے۔

رکشہ سڑکوں کا گلوکار ہے۔ آپ مفلر سے کان لپیٹ کر، اپنے سر پر ہیلمٹ بھی رکھ لیں، تب بھی اس کی آواز آپ کے دل تک پہنچ ہی جائے گی۔ سڑک پر گزرتے ہوئے بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے، جیسے بندے کے اندر بھی دو تین رکشے چل رہے ہیں۔ مقبولِ عام گیت سناتا ہے کہ ساؤنڈ پروف کمروں میں گوشہ نشینوں کے دل بھی دہل جاتے ہیں۔ فطرت کا اصول یہ ہے کہ زندہ وہی شے رہتی ہے، جس میں زندہ رہنے کی اہلیت ہو۔ علمِ معاشریات میں اس کو ''ڈھٹائی'' کہا جا سکتا ہے اور یونانی فلسفیوں سے لے کر ابنِ خلدون تک سب نے حضرتِ انسان کے فقط اسی ایک امتیاز پر بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں اشرف المخلوقات کی پہلی اور آخری شان ہی ڈھٹائی پر مبنی ہے کیوں کہ یہ قدرتی آفات اور فطری عناصر کی تمام تر کوششوں کے باوجود زندہ رہتا ہے۔ کاش یہ حضرات اس دور میں زندہ ہوتے اور یہ رکشے کے آگے زندہ رہ کر دکھاتے۔ رکشہ جب کسی قبرستان سے گزرتا ہوگا، مُردے آپس میں کہتے ہوں گے۔ ''چلو اٹھو بھی، صورِ اسرافیل (سیکنڈ) پھونک دیا گیا ہے۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، چڑیا گھر اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں گئے۔ کیوں کہ چڑیا گھر میں جو چرند، پرند اور درند وغیرہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں، ان کا تعلق ہماری ہوش سے پہلے کا ہے، دوسرے، تنخواہ دار بندہ جو پھل مہینوں افورڈ نہیں کر سکتا، بندر روز ہی کھاتا ہے۔ مولوی، پہلوان اور شیر کا میٹو دیکھ کر فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اس سے تو بہت سے پیٹ پل سکتے ہیں۔ بعینہٖ، ہم نے آج تک رکشہ کبھی اپنی منشاء سے نہیں روکا کیوں کہ فردِ واحد رکشہ میں سفر کرے تو وہ اپنی ہی نظروں میں چھوٹا اور فضول خرچ ٹھہرتا ہے۔ بہ امرِ مجبوری، ہم نے جب بھی رکشے کی سواری کی ہے، یہی محسوس ہوا ہے، جیسے گناہِ صغیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہم جب اس سواری کا موازنہ گھڑ سواری سے کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ خدائے وحدہ لاشریک نے گھوڑے کی شکل میں ایک ہی باعزت سواری تخلیق کی تھی۔ گھوڑے کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اس پر بیٹھ کر انسان کی شخصیت مجروح نہیں ہوتی اور دوسری یہ کہ اس میں انجن نہیں ہوتا۔

اب ذرا اس منہ پھٹ سواری یعنی رکشہ کا جائزہ لیں۔ جب سائنس دانوں نے یکے بعد دیگرے باعزت اور آرام دہ سواریاں ایجاد کر لیں تو کسی سائنس دان نے سوچا ہوگا کہ دنیا میں اتنی وافر سواریاں ایجاد ہوگئی ہیں کہ روئے زمین پر کوئی اپنی مرضی سے پیدل چلے تو چلے، ڈرائیور کنڈکٹر اسے پیدل نہیں چلنے دیں گے۔ لہٰذا ایک سواری ایسی بھی ہونی چاہیے کہ جسے دیکھتے ہی پتہ چلے کہ خدا نے انسان کی اس حد تک آرام طلبی سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور آئندہ ایجادات کا سلسلہ ہی ختم کر دیا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے ایک دوست کو شرارت سوجھی کہ اس نے ہم سے پوچھا کہ رکشہ کے لفظی معنی کیا ہیں۔ ہم نے زندگی بھر کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس بھدی اور بدصورت شے

کے مفہوم میں سوائے دھوئیں، شور شرابے اور سواریوں کے علاوہ بھی کچھ نکلتا ہے۔ ہم نے اپنی حاضر دماغی کو بروئے کار لاتے ہوئے سب سے پہلا جواب تو یہی دیا کہ جس روز کسی سائنس دان سے کچھ نہیں بن سکا ہوگا تو اس نے یہ بے ڈھنگی چیز بنادی ہوگی۔ بہر حال ہم نے ہمت کر کے اپنی گردن کو سڑک سوار رکشاؤں کی سات آٹھ پشتوں کا اس نیک نیتی سے مطالعہ کرنے کے لیے گھمایا کہ شاید کسی پینٹر نے رکشہ کا لفظی یا آزاد ترجمہ بریکٹوں میں لکھ دیا ہو مگر یہ ہماری رکشانہ اور طفلانہ سوچ تھی۔ پھر ہم نے اپنی طبیعت پر کچھ اور زور دیا تاکہ کوئی نیا مضمون نکالا جاسکے۔ چناں چہ کہنا شروع کر دیا کہ رکشہ رکشہ ہوتا ہے، ٹیکسی کے معنی تو تم خوب سمجھتے ہو۔ رکشہ ہی رکشہ سے پیچھے رہتا ہے، اور رکشہ ہی رکشے سے آگے نکلتا ہے اور کبھی کبھار رکشہ ہی اُلٹ جاتا ہے۔ رکشہ ہی رکشہ کا رقیب اور رکشہ ہی رکشہ کا حبیب ہوتا ہے۔ رکشہ اپنے موجد کی بہت بڑی غلطی ہے، جس کا احساس اسے شاید مرنے کے بعد ہوا ہوگا کہ میں دنیا میں کیا ایجاد کر کے خود مزے سے قبر میں آرام فرما ہوں۔ تین پہیوں پر چلتا ہے لیکن صراطِ مستقیم پر نہیں چلتا۔ اس کی حرکتوں سے سڑک کی دیگر سواریاں ہر لمحہ تنگ ہوتی ہیں۔ ٹرک میں ڈوب کر کار کے پیچھے سے نکلتا ہے۔ اگر کوئی مریض آپریشن کروا کر اس میں بیٹھ جائے تو اس کے سارے ٹانکے کھل جاتے ہیں بلکہ اس کے جوڑ کھلنے کے امکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں۔

یہ واحد سواری ہے، جو سیدھی ناک پر چلتی ہے، اگر ناک گزر جائے تو یہ بھی گزر جاتی ہے۔ اس کی حرکت نوٹ کی جائے تو ایسے لگتا ہے، جیسے بیل ابھی ابھی خطِ منحنی میں بول کرتے گزرا ہے۔ کسی وقت یہ سانپ کی طرح رینگتا ہے اور کسی وقت مور کی طرح رقص کرنا بھی شروع کر دیتا ہے اور راستہ خالی مل جائے تو رکشے کی رفتار قابلِ رشک ہو جاتی ہے۔ یہ

پٹرول پیتا اور کان کھاتا ہے۔

تیل پیتا ہے ، کان کھاتا ہے!
اور رکشے میں کیا بُرائی ہے

یہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں فوراً گھوم جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ خوبی صرف سیاست دانوں میں ہوتی ہے۔ اس کے موڑ کاٹنے سے خوف آتا ہے کیوں کہ اس کا کوئی انڈی کیٹر نہیں ہوتا۔ ہر لمحہ اس بے چین روح پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ یہ آگے جا رہا ہو تو ایسے لگتا ہے کہ سڑک پر آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کی آواز اور دھواں کانوں اور ناک کے راستے دلوں تک اترتا چلا جاتا ہے اور اس کا دھواں بندے کے اندر اتنی مشک مچاتا ہے کہ اسے قے آجاتی ہے۔ اس میں دو سواریاں بیٹھ جائیں تو وہ گیند کی طرح اچھلتی ہیں، البتہ تین بیٹھ جائیں تو ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر سفر خوش گوار گزرتا ہے۔ بوقتِ ضرورت آگے پیچھے آٹھ سواریاں بھی بیٹھ سکتی ہیں۔

ہمارے دوست نے کہا کہ تم نے اپنی جہالت کو چھپانے کے لیے یہ تقریر کی ہے۔ ہم نے اسے جواب دیا کہ بناوٹ کے اصولوں سے جہالت نہیں چھپ سکتی۔ ہم نے سچ کہا ہے۔ اس نے ہماری جان بخشتے ہوئے فرمایا کہ چلو یار! ڈکشنری سے دیکھ کر بتا دینا۔ اسی روز ہمیں ایک کباڑیے سے ڈکشنری خریدنی پڑی۔ گھر جا کر علم ہوا کہ کباڑیے نے لوڈ شیڈنگ کے دوران موم بتی کی روشنی میں ڈکشنری کی بجائے ''کنزالجربات'' کا ایک بوسیدہ نسخہ تھما دیا تھا۔ گھر پہنچ کر ہمیں مجبوراً اپنے آبا کی ڈکشنری کریٹ سے نکال کر دیکھنا پڑی تو رکشہ کے لفظ کا کہیں دُور دُور تک نشان نہیں تھا۔ رکشہ کے معنی تلاش کرتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوا، جیسے ڈکشنری ترتیب دینے والا بھی کسی زمانے میں رکشہ ڈرائیور ہی تھا کیوں کہ اس

مردِ ناداں نے پہلے تو سائیکل رکشہ کا مطلب سمجھایا تھا اور پھر موٹر رکشہ کا۔ بہر حال رکشے کی ایجاد کے بارے میں ایک تن درست و توانا روایت یہ بھی ہے کہ اس کے موجد نے متواتر کئی دن تک غور و خوض کیا۔ ایک روز وہ اسی پریشانی کے عالم میں کسی ایسے غسل خانے میں گھس گیا، جس کی چھت نہیں تھی۔ جب اس نے ٹھنڈے یخ پانی کے دو چار مگ اپنے تخلیقی سر پر ڈالے تو اسے تکونی غسل خانہ رکشہ کی شکل میں اُڑتا ہوا دکھائی دیا۔ نہانے کے بعد اس نے غسل خانے کا طول و عرض ماپا اور پھر اس میں ایک عدد جاپانی انجن فِٹ کرنے کے بارے میں سوچا۔ بندہ رکشے میں واقعی اس طرح بیٹھتا ہے، جس طرح غسل خانے میں بیٹھتا ہے۔

ایک روز ہمارا ایک دوست باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ ہمارے ابا جان نے ہمارے لیے جو مکان تعمیر کیا ہے، وہ سڑک سے ڈیڑھ میل ہٹ کر ہے۔ میرے خیال میں بندہ زندگی کی شاہراہ پر اس لیے پیچھے رہ جاتا ہے کہ اس کے گھر کے قریب سے کوئی شاہراہ نہیں گزرتی۔ اس نے کہا کہ ہم سڑک سے جتنی دور رہتے ہیں، رات کو اگر فلم یا ڈراما دیکھ کر گھر آنا پڑ جائے تو رکشہ ٹیکسی والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رکشے میں سفر نہیں کرنا چاہتے بل کہ اسے اغوا کرنا چاہتے ہیں چناں چہ اس نے پراپرٹی ڈیلروں کو منہ مانگا کمیشن دے کر لب سڑک ایک گھر خرید لیا۔ ایک ماہ بعد اس سے ملاقات ہوئی تو ہم نے پوچھا کہ سڑک پر تمہارا مکان کیسا جا رہا ہے؟ کہنے لگا۔ ''نقل مکانی کا یہ جذبہ تو اب رنگ لایا ہے'' ''وہ کیسے؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا۔ ''ایک تو مجھے رات آئے کسی ایسی جگہ جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ میں رات گئے واپس آتا، دوسرے ہر دو منٹ بعد اس سڑک پر رکشہ گزرتا ہے۔''

بڑے کہا کرتے تھے کہ کوے کی کائیں کائیں مہمانوں کی آمد کا اشارہ ہوتی ہے۔

آج کے دور میں کوے کی جگہ رکشے نے لے لی ہے۔ یعنی سڑک پر رکشہ کی گڑگڑاہٹ سنائی دے تو سمجھ لیں کہ دو چار مہمان آئے کہ آئے۔ جوں جوں رکشہ قریب آتا جاتا ہے، ایسے لگتا ہے کہ میرے کمرے میں گھستا چلا آرہا ہے۔ ایک فرلانگ تک تو اس کا راگ ہماری سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ اتنے میں دوسرا آجاتا ہے اور پھر تیسرا۔ رکشے کی آواز کو تو بندہ ڈھیٹ ہوکر برداشت کرلیتا ہے کہ یہ شوروغل تو اس کے انجن کے دل کی آواز ہے لیکن اس کے علاوہ وہ کچھ آوازیں، جن کی ہمیں آج تک سمجھ نہیں آئی۔ اپنے انجن سے مشورہ کیے بغیر بھی نکالتا ہے۔ مثلاً کسی وقت اسے زنانے دار چھینک آجاتی ہے۔ یہ آواز سن کر خیال آتا ہے کہ اس کے انجن اور سائیلنسر میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ انجن اپنے اندر لگی ہوئی آگ کے ہاتھوں مجبور ہے اور جن خیالات کا اظہار کررہا ہے، سائیلنسر انھیں اتنی سعادت مندی سے عوام تک نہیں پہنچارہا۔ ایک دم ایک آواز آتی ہے۔ ''ٹھاہ''۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ رکشہ الٹ گیا ہے لیکن یہ بھی اس کے کھانسنے کا ایک اصول ہے اور جب اس کا کوئی نافرمان ٹائر پھٹتا ہے تو محلے کے ہر گھر میں سے کم از کم ایک ایک فرد ضرور باہر نکلتا ہے۔ یہ لمحہ اہلِ محلّہ پر بہت گراں گزرتا ہے۔ اب تو ہمارا ارادہ ہے کہ۔

''دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو''

رکشے میں سوار ہونے کے عمل کر لیجئے۔ اس میں بیٹھنے کے لیے سواری کا جسم ربڑ کا ہونا چاہیے۔ اس کم بخت، کم ظرف اور پست قد کے دروازے اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ بندہ اس میں سیدھا اور پورا داخل نہیں ہوسکتا۔ پہلے اسے اپنا ایک بازو، ایک ٹانگ اور آدھا دھڑ داخل کرنا پڑتا ہے۔ بعض جلد باز ڈرائیور اپنی سواری کے اتنے ہی حصّوں کو فوراً لے کر چل پڑتے ہیں۔ رکشے میں سوار ہونے کے لیے کئی مرتبہ سکڑنا اور کئی مرتبہ سمٹنا پڑتا ہے۔ اس

ساری مشکل کا واحد حل یہ ہے کہ بندہ اپنے سپیئر پارٹس جوڑوں سے نکال کر گٹھڑی کی صورت میں ساتھ رکھ لے۔

صاحبو! آپ تو جانتے ہیں کہ گدھے کی سواری کا اپنا مزا ہے، گھوڑے کی سواری کا اپنا مزا اور ٹرین بس کا اپنا لطف لیکن رکشے میں بیٹھ کر اس کے ہر گیئر کا الگ مزا ملتا ہے۔ رکشہ ڈرائیور جب بجلی کی ٹیوب کی مانند ایک لمبے سے راڈ کو اوپر کھینچتا ہے تو اس جھٹکے کے ساتھ رکشے کی رگ رگ میں یہ پیغام سما جاتا ہے کہ اب چلنا چلنا مدام چلنا ہے۔ سٹارٹ ہوتے ہی سواری کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں۔ بلا شُبہ رکشے میں سوار ہونے کے بعد بندے کی خودی کافی پست ہو جاتی ہے لیکن اس کے پہلے گیئر سے بندہ کانپنے لگتا ہے۔ یہ عجیب طرح کی لرزش ہوتی ہے۔ پھر یہ لرزش میٹھی میٹھی اور ہلکی ہلکی خارش میں بدل جاتی ہے۔ یہ خارش ایسی ہوتی ہے کہ اسے لفظوں میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس گیئر میں ایک سواری کا سر بھی دوسری سواری سے ٹکرا جاتا ہے۔ اگر دوسری سواری میئر نہ ہو تو رکشے کے اندر والی سلاخوں سے ٹکرا جاتا ہے۔ دوسرے گیئر میں اگرچہ رکشے کی طبیعت میں قدرے روانی آ جاتی ہے لیکن سواری کو یہی محسوس ہوتا ہے، جیسے نیچے سے کوئی چیز کھینچی جا رہی ہے۔ الفاظ اس کیفیت کو بھی بیان نہیں کر سکتے۔ بہر حال اس کا ہلکا ہلکا سرور ضرور ملتا ہے۔ تیسرے گیئر میں سواری کو اپنے جملہ اعضاء کی فکر پڑ جاتی ہے اور چوتھے گیئر میں تو اپنی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ پُرانے زمانے میں لوگ اس لیے طویل عمریں پاتے تھے کہ وہ حج کرنے بھی پیدل ہی جایا کرتے تھے۔

ہماری ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کے پیشِ نظر رکشے کا سفر خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ دورانِ سفر ایک تکیہ ساتھ ہونا چاہیے۔ تاکہ اسے سلاخوں پر رکھا جا سکے اور سر بار بار ٹکرانے

سے محفوظ رہے۔ احتیاطاً سپرٹ کی شیشی اور کچھ پٹیاں بھی پاس ہونی چاہییں۔ بعض اوقات سڑکوں پر بجری بھی پڑی ہوتی ہے۔ ایسی سڑک پر رکشے کے چلنے سے بندے کے پیٹ میں گدگدی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ گدگدی پیٹ سے ہوتی ہوئی پشت کی طرف چلی جاتی ہے۔ اگر سڑک پر گڑھے ہوں تو پیٹ میں باقاعدہ درد شروع ہو جاتا ہے۔ گڑھوں والی سڑک پر تو سواری کو بہت چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اسے کئی نازک مقامات پر کمر توڑ جھٹکوں سے بچنے کے لیے اپنی نشست سے بار بار اچھلنا پڑتا ہے۔ زیادہ گڑھے ہوں تو بندہ رقص کرنے لگتا ہے۔

ایک دفعہ ایک دوست نے گھر سے باہر رکشہ روکا۔ رکشے والا سگریٹ کے بہانے قریبی کھوکھے پر کھڑا ہو گیا۔ دوست نے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہی اپنے سب چھوٹے موٹے رکشے میں بٹھا دیے۔ جب رکشہ منزلِ مقصود پر پہنچا تو ڈرائیور نے جونہی مُڑ کر اپنے ہی رکشے سے مرغیوں کی طرح متواتر سواریاں اترتے دیکھیں تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دوست نے سمجھا کہ اسے کوئی سکتہ وغیرہ ہو گیا ہے۔ تیرہ روپوں کے بدلے جب سولہ سواریاں ڈرائیور کے سامنے نیچے اتریں تو اس کی حالت کا اندازہ کرنا کیا مشکل تھا؟

رکشہ ڈرائیوروں اور ٹریفک پولیس کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اینٹ کُتے کا بیر ہے۔ وہ سپاہی کیا، جو رکشہ نہ روکے اور وہ رکشہ ڈرائیور ہی کیا، جو اشارہ نہ توڑے۔ ایک رکشہ ڈرائیور دوسرے کو بتا رہا تھا کہ ایک چوک پر اُس کے رکشے نے سپاہی سے صرف ماں کی گالیاں کھائی ہیں اور دوسرے چوک پر صرف بہن کی۔ میں سوچ رہا ہوں کہ رکشے تو دراصل گالیوں سے چلتے ہیں، ان میں پٹرول ڈلوانے کی ضرورت ہی نہیں۔

ایک چوک پر سپاہی ہر آنے والے رکشے کو ہاتھ دے کر روکتا اور ڈرائیور کو حکم دیتا

کہ وہ سامنے پان سگریٹ کی دُکان پر اس کے اکاؤنٹ میں حسبِ توفیق کچھ نذرانہ وغیرہ جمع کرادے۔ ایک چالاک رکشہ ڈرائیور کو جب سپاہی نے روکا تو وہ سیدھا پان والے کے پاس پہنچا۔ رکشے سے اتر کر سپاہی کی طرف منہ کر کے اس نے یونہی ہوا میں اپنی انگلیوں کے چند اشارے کیے۔ اس نے کہا کہ وہ سپاہی کہہ رہا ہے کہ میرے جتنے پیسے جمع ہو گئے ہیں، مجھے دے دو۔ پنواڑی نے سپاہی کے تمام پیسے رکشہ ڈرائیور کو تھما دیے۔ رکشہ ڈرائیور نے سپاہی کی تمام رقم جیب میں ڈالی اور چوتھے گیئر میں رفو چکر ہو گیا۔

ہمارے ہاں رکشے پٹرول سے نہیں چلتے، ماؤں کی دعاؤں اور استادوں کی بددعاؤں سے چلتے ہیں کیوں کہ رکشوں کی پشتوں پر لکھا ہوتا ہے، جس نے ماں باپ اور استاد کو ستایا۔ اس نے رکشہ ہی چلایا، رکشوں کے پیچھے ایسی ایسی مزے دار تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ سفر کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ایک رکشے پر لکھا تھا۔ ''یہ رکشہ مجھے سسرال نے جہیز میں دیا تھا۔ اللہ ہر ایک کو ایسے مخیر سسرال دے۔ ساغر صدیقی کا یہ شعر ۔

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

بہت سے رکشوں پر لکھا نظر آتا ہے حالاں کہ یہ شعر تو اسے پڑھنا چاہئے جو رکشے کے پیچھے چلتا ہے۔ جلنے والے کا منہ کالا، کھیڈ مقدراں دی، پپو یار تنگ نہ کر، تو لنگ جا ساڈی خیر اے، سونیاں ضد نہ کر، خان آپ بڑا ضدی اے۔ قسمت میں لکھا تھا، تقدیر آزما رہا ہوں، اک بے وفا کی خاطر رکشہ چلا رہا ہوں، جیسے جملے ہماری قومی نفسیات اور ہمارے رویوں کی عکاسی کرتے ہیں، رکشہ میں سوار ہونے سے پہلے اپنی جیب اور پیٹ کو ضرور چیک کر لینا چاہئے۔

خدانخواستہ روئے زمین سے اگر رکشے ختم ہو جائیں تو پھر کیا بنے۔ کتنے خاندان بے روزگار ہو جائیں۔ کتنی سواریاں اپنی منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکیں، کتنے چالان نہ ہو سکیں۔ ٹریفک پولیس کا مطلب ہی فوت ہو جائے۔ سڑکوں پر سناٹا چھا جائے۔ لوگوں کے کان رکشہ کے سائیلنسر کی آواز کو ترس جائیں۔ وہ ہنگامے جو درونِ خانہ اور بیرونِ خانہ اٹھتے ہیں، وہ نہ اٹھیں اور کیف ولذت کے یہ سارے مرحلے اگر ختم ہو کر رہ جائیں تو زندگی کتنی سونی اور اداس ہو جائے! اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

انکل آف روڈ

تانگے کے لفظ پر غور کیا جائے اور پھر تانگے کے ایک ایک جزو پر نظر ڈالی جائے تو یوں لگتا ہے جیسے تانگے سے مراد ہی تنگ کرنا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ تانگہ لاہور کا ہو یا جھنگ کا، تانگے والا سب کی خیر ہی مانگتا ہے۔ تانگے کے ہیرو یعنی اس کے گھوڑے پر کچھ سلجھی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو اس کا انگ انگ تانگے سے تنگی کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔ کیوں کہ گھوڑے کے منہ، گردن، آنکھوں، کانوں اور دُم پر پوشش کی وائرنگ اسے اس حد تک پارسا بنا دیتی ہے کہ ڈیوٹی کے دوران نہ تو وہ یاوہ گوئی کر سکتا ہے۔ نہ کسی نامحرم کو میلی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ نہ اِدھر اُدھر سے ڈسکو گانے سن سکتا ہے۔ حتّٰی کہ وہ اپنا پیدائشی حق بھی استعمال نہیں کر سکتا، یعنی اپنی دُم سے نہ تو مکھی اُڑا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو دولتا وغیرہ مار سکتا ہے۔ گھوڑوں کو کسمپرسی اور بے چارگی کی اس حالت میں دیکھ کر ان کا بے داغ اور تابناک ماضی ہماری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں نے اسلامی فتوحات کا آغاز گھوڑوں پر ہی کیا تھا۔ پھر یہ گھوڑے اتنے نمک حلال اور فرض شناس نکلے کہ وہ جان تلی پر رکھ کر بحرِ ظلمات تک پہنچ گئے۔ ہم مسلمانوں کو چاہیے تو یہ تھا کہ ان کا سابقہ ریکارڈ دیکھتے ہوئے نہ صرف انھیں سر آنکھوں پہ بٹھاتے بلکہ معاشرے میں انھیں باعزت مقام بھی دیتے مگر

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

یعنی آج نہ تو وہ پہلے والے مسلمان ہیں اور نہ ہی پہلے والے گھوڑے۔ کیوں کہ ہم پر تو غیر اقوام نے زین کس رکھی ہے اور گھوڑے اپنے اور اپنے مالک کے پاپی پیٹ کی خاطر بحرِ ظلمات کی بجائے بحرِ سڑکات پر دوڑ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تانگے کا مالک گھوڑے کا اس قدر استحصال کرتا ہے کہ اس کی چاروں ٹانگوں کی کمائی خود ہی کھا جاتا ہے حتّٰی کہ گھوڑے کے حصے میں صرف ''پھک'' ہی رہ جاتی ہے۔ پھک کا گھوڑوں کا کچھ فائدہ ہوتا ہے کہ نہیں مگر جب وہ اسے اپنے نظامِ انہضام سے گزارنے کے بعد سنہری سفوف کی صورت میں سڑکوں پر بکھیرتے ہیں تو یہ رات دن راہ گیروں کے لیے سرمۂ ہیرا پھیری اور سلیمانی چورن کا کام دیتا ہے۔

تانگے کی ایجاد کسی ایسی منجی پیڑھی ٹھونکنے والے کی ذہانت وفطانت کا کرشمہ ہے کہ جس کے دل میں اپنی پامال قوم کا درد حد سے گزر چکا تھا۔ ویسے بھی مشینوں کی حکمرانی میں تمام تر اختیارات عزرائیل صاحب کے پاس ہوتے ہیں کیوں کہ سائنسی آلات مروّت ومحبت کے تمام تر احساسات کو کچل کے رکھ دیتے ہیں۔ منجی پیڑھی ٹھونکنے والے نے مسلمانوں کو دستِ فرنگ سے آزاد کرنے اور انھیں سطحِ زمین سے چند فٹ بلند کرنے کے لیے چارپائی کو دو پہیے لگا کر اور پھر اس کے درمیان ایک ''پھٹی'' کو مولٹی فوم میں سی کراس انداز سے حد بندی کرنے کا سوچا ہوگا کہ سرہانے اور پائینتی کی طرف تین تین افراد کے بیٹھنے کی گنجائش پیدا ہو جائے۔ تانگے پر سواری کرنے سے نہ صرف جذبۂ اخوت ومحبت ابھرتا ہے بلکہ سواریوں کے کپڑوں اور سروں کی جوؤں کو باہم تبادلے کا سنہری موقع بھی فراہم ہو جاتا ہے۔

کوچوان اپنا تانگہ لوئے لوئے بھرنے کے لیے ایک خاص تکنیک یہ استعمال

کرتے ہیں کہ وہ دو چار ''میسنے'' سے کولیگز مانگ تانگ کر ٹانک لیتے ہیں۔ اس طرح جب وہ ''بھائی لوہاری۔ کلی سواری'' کی آواز لگا کر ہم جیسی سادہ لوح سواریوں کا او پازیٹو گروپ کا لہو سوز یقیں سے گرماتے ہیں تو اس کی مکر کی چال میں آ کر انتہائی سادگی سے ہم تانگے پر سوار ہو جاتی ہیں۔

تانگے پر چھے سواریاں بیٹھ جائیں تو کوچوان کی حالتِ زاریوں ہوتی ہے جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ جب تک سواریاں ایک دوسرے سے ضرب نہ کھا جائیں، چند سواریاں پائیدانوں پر نہ اٹک جائیں۔ کچھ بموں کا سہارا نہ لے لیں، اس وقت تک اسپ تازی کو چلنے کا اِذن ہی نہیں ملتا۔ ان حالات میں بسا اوقات گھوڑے صراطِ مستقیم میں چلنے کی بجائے صراطِ منحنی پر ہنہنانا شروع کر دیتے ہیں۔ حتّٰی کہ ری لیکس ہونے کے لیے اپنے آپ کو فضا میں معلق کر کے پنگھوڑے والے گھوڑے بن جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تانگے کی ایجاد ایک حادثہ ہے۔ ویسے بھی......

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

پھر اس حادثے سے روزانہ ہزاروں حادثے جنم لیتے ہیں۔ تانگہ چل رہا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے سڑک کا ''ماما'' چل رہا ہے۔ کیوں کہ نہ تو اس کے رکنے کا پتا چلتا ہے اور نہ مڑنے کا۔

یہ راہ گیروں، سائیکل سواروں، موٹر سائیکلوں، رکشاؤں اور کاروں کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام ہے۔ یہ کسی سے ٹکرا جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا مگر دوسرے کا کچھ نہیں بچتا۔ تانگہ کسی کار سے ٹکرا کر لاکھوں کا نقصان بھی کر دے تو کوچوان بڑی معصومیت

سے کہہ دیتا ہے کہ بابو جی! بے زبان ہے اس کی کونسی بریک ہے؟ تانگے پر سواری کرنے سے پہلے جسم پر مالش ضروری ہے اور بعد میں (یقینی) ای سی جی۔

ہمارے ایک مہربان اکثر کہا کرتے تھے کہ معمولی سے معمولی کام کی بھی تکنیک ہوتی ہے اور ہر کام کا کوئی نہ کوئی اُستاد ہوتا ہے۔ ہم عقل و دانش سے بھرپور اس قسم کے اور بھی مقولے نہایت توجہ سے سنا کرتے تھے اور نہایت خلوص اور لاپروائی سے ان پر عمل نہیں کرتے تھے۔ شمالی علاقہ جات (شادباغ، وسن پورہ، مصری شاہ وغیرہ) کے کوچوان حضرات نئی آنے والی سواریوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور انھیں اپنے تانگوں اور تانگوں میں پہلے سے بیٹھی سواریوں کی ٹانگوں میں پھنسانے میں اپنے اپنے تانگے اور گھوڑے کے ایسے ایسے اوصافِ حمیدہ وخمیدہ باآواز بلند کرتے کہ ہر کوئی اس اوپن ائر سواری پر سوار ہونے کے لیے ایک دوسرے سے پہلے قدم بڑھاتا۔ ہم نے کوچوان کو اپنے گھوڑے کی اہلیت اور گھوڑیت پر نہایت پُرسُوز راگ الاپتے بھی سنا ہے۔ بعض گھوڑے اور گھوڑیاں گا گا کر سواریاں بٹھاتے تھے۔ ہم کوچوان کے گھوڑے گھوڑیاں گانے کو ہمیشہ پرورشِ شکم (شکم کو جمع ہی سمجھئے، کوچوان اور گھوڑے کا شکم) کی گہری صدا سمجھتے اور اس کے منشور پر ایمان لاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے فوراً تانگے میں سوار ہو جاتے۔

ایک روز ہم ایک ایسے ہی چرب زبان اور گانٹھ کے پورے (اس نے تانگے کی چھت اپنے متروک تہمد کو نہ جانے کتنی گانٹھیں دے کر بنائی تھی) کوچوان کے گلوگیر قصیدوں سے متاثر ہو کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ اس نے ہمیں آنکھ جھپکنے سے پہلے پہنچنے کے سرسبز باغ دکھائے تھے۔ ہم تانگے پر بیٹھ کر اس کے پہیوں کی جنبش کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ کوچوان نے ہمیں فرماں بردار قسم کی سواری سمجھتے ہوئے حکم دیا "اپنی سیٹ کے نیچے سے

بالٹی اور پھک کا توڑا نکال دو" ہم نے تھوڑی دیر قبل بیگم کو ہنڈیا بھونا چھڑوا کر اس بے چارگی سے اپنا سوٹ استری کرایا تھا۔ اب ہم نے اپنی نشست کے نیچے سے بالٹی اور پھک کا توڑا تلاش کرنے کے لیے اپنا ہاتھ لمبا کیا تو ہمارے استری شدہ کُرتے کا اگلا حصہ تانگے کے گرد آلود فرش پر جاروب کشی کرنے لگا۔ بالٹی اور پھک کا توڑا ہماری آستینوں سے باہر تھے۔ اتنی دیر میں کوچوان نے رعب دار آواز میں کہا" بابو! بے زبان کو پانی پلانا ہے، ذرا سیٹ کے نیچے لیٹ کر بالٹی اور توڑا نکال دو۔ بے زبان جانور کی صحرا ہوتی زبان ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ ہم گھٹنوں کے بل سیٹ کے نیچے سے بالٹی اور پھک کا توڑا نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ کوچوان نے جب ہمارے ہاتھ منہ اور کپڑے گرد کے ذرّات سے چمکتے ہوئے دیکھے تو بولا" انسان کا کیا ہے، مٹی کا بنا ہوا ہے اور اس نے مٹی ہی میں جانا ہے۔" آج ہم واقعی مٹی کے بنے ہوئے لگ رہے تھے۔ کوچوان بالٹی لے کر پانی لینے چلا گیا۔ اتنے میں ایک اور سواری نے تانگے میں قدم رنجہ فرمایا۔ سواری نے پوچھا" تانگہ کب چلے گا؟" ابھی تو کوچوان گھوڑے کے لیے پانی لینے گیا ہے۔" خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا۔" جب دس پندرہ منٹ گزر گئے تو ہم کوچوان کے قدموں کے نشانات کا سراغ لگاتے ہوئے ساتھ والی گلی میں چلے گئے۔ یہاں دوسرے کوچوانوں کی خالی بالٹیاں قطار میں اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔ نلکا بھی کوئی بندے دے پتروں والی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل خراب ہوتا تو چلو بھر پانی کی اُلٹی سی کر دیتا۔ ہم اخلاقاً کوچوان کو اپنے سواری ہونے کا ثبوت دے چکے تھے۔ پندرہ منٹ بعد نلکے کی ناک میں کچھ روانی پیدا ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد کوچوان نے پانی کی بالٹی بھر لی اور ہم اس کے گھوڑے کے غم گسار بنے اس کے ساتھ خراماں خراماں واپس اڈے پر آ گئے۔ دو سواریوں کا مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک

سواری نے کوچوان کو دیکھتے ہی کہا بھئی! کیا تمہارا تانگہ آٹو میٹک ہے؟ خاتون سواری نے کہا
''ہوا کیا ہے؟'' کوچوان نے پوچھا۔

ہونا کیا تھا؟ گھوڑے کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ چل پڑا۔ اسے کھڑے کھڑے کافی دیر ہوگئی تھی۔ اس نے پہلے جتنا پانی پیا تھا، وہ اس کے پورے جسم کو غسل دے چکا تھا۔ گھوڑا پانی کی تلاش میں چل پڑا تھا یا اس نے سواریوں کے وزن اور اخلاقی دباؤ کے پیشِ نظر یہ اچانک چہل قدمی شروع کر دی تھی۔

گھوڑا تذبذب کے عالم میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر مڑ رہا تھا۔ اس نے اڈے کے دو چکر لگائے۔ اڈے پر کھڑے لوگ ہمارے گھوڑے کی بانکی چال سے محظوظ ہو رہے تھے اور ہم یہی سوچ رہے تھے کہ ہمارا پیارا ملک پاکستان بھی معرضِ وجود میں آنے کے بعد کچھ اس طرح بغیر کوچوان کے چل رہا ہے۔

کوچوان نے اپنے گھوڑے کو پانی پلایا اور سگریٹ سُلگا کر اس کی لگام تھام لیں۔ آدھ گھنٹہ تو گھوڑے کو اسٹارٹ کرنے میں گزر چکا تھا۔ جب تانگے پر سواریوں کا کورم پورا ہو گیا تو کوچوان کے چہرے پر ایک پُر اطمینان تبسم ابھرا۔ گھوڑا نہایت سست رفتاری سے چلنے لگا۔ اسی لمحے ایک سمارٹ سی گھوڑی اسے کراس کرتے ہوئے آگے بڑھی تو کوچوان نے اپنے گھوڑے پر طنز کا سانٹا برساتے ہوئے کہا ''کجھ شرم کر، تیری نانی اگے لنگ گئی اے'' (کچھ شرم کرو، تمہاری نانی تم سے آگے نکل گئی ہے)۔ ہمارا گھوڑا نہایت بے دلی اور بے زاری سے چل رہا تھا۔ کوچوان نے گھوڑے کی والدہ کی شان میں سخت الفاظ کہے، جس کا اس نے مزید سست ہو کر ردِ عمل ظاہر کیا۔ ہم بُری طرح پھنس چکے تھے۔ گھوڑے کی چال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجنوں کی طرح چل رہا ہے۔ کوچوان نے گھوڑے پر سانٹوں کی

بارش کردی، ہم نے اب غور کیا کہ ہم نے تانگے کا انتخاب کرتے ہوئے سنگین غلطی کی تھی۔ گھوڑے کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ گھوڑا اتنا فاقہ کش اور نحیف و نزار تھا کہ گھوڑا کیا تھا، گھوڑے کا ایکسرا تھا۔ ماضی میں جو گھوڑے کے ساتھ زیادتیاں روا رکھی گئی تھیں، اس کی ایک ایک پسلی ان زیادتوں بے چارگیوں اور بے گھاسگیوں کی گواہی دے رہی تھی۔

ایک سواری نے کہا اسے (گھوڑے) بھی شاید خلوصِ دل یا خلوصِ نیت سے انسان بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بے روزگاری سے تنگ اور فاقوں سے نڈھال چہرے اور برائے نام معاوضے کے بدلے سیٹھ ساہوکاروں کی خدمت کرنے والے مدقوق چہرے راہ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں اور اُمراء کے نزدیک شاید یہی لوگ معاشرے کا حُسن ہیں اور اب معاشرے کے حُسن کو چار چاند لگانے کے لیے گھوڑوں کے ساتھ بھی انسانوں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔

یہ تانگہ جس رفتار سے چل رہا تھا، ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ہم اس میں بچپن میں بیٹھے تھے اور اب شباب کے زمانے میں گزر رہے ہیں اور جب دہلی دروازے پہنچیں گے تو ہمارے بال اور بھنویں سفید ہو چکی ہوں گی۔ ایک سواری نے سرگوشی کے انداز میں بتایا کہ یہ کوچوان اتنا خرانٹ ہے کہ اپنے تانگے کو دیگر تانگوں کے درمیان پھنسا کر کھڑا کرتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس کے گھوڑے کی کمزوریوں پر دوسرے گھوڑوں کی تنومندی کا پردہ پڑا رہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کوفت ہو سکتی ہے کہ جب سڑک کے کنارے یہ بورڈ نظر آتا کہ ''آہستہ چلیں'' تو ہمارا جی چاہتا کہ کاش ہم بورڈ کی ہدایت کے مطابق کم از کم آہستہ ہی چلیں ہمیں اب یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم نے صبح صبح شاید کسی مریل گدھے کی شکل دیکھ لی تھی۔ حالاں کہ ہمارے قریب سے بہت سے گدھے ریڑھیاں کھینچتے ہوئے نہایت افتخار کے

ساتھ ہمیں اور ہمارے گھوڑے کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ گدھے ہمیں شاید یہ پیغام سنا رہے ہوں۔ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو'' ہم نے جب بھی کہیں عازمِ سفر ہونے کے لیے کسی تانگے کا انتخاب کیا ہے، ہمیشہ عُجلت ہی میں کیا ہے۔ اس کے آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھا۔ وہ الگ بات ہے کہ ''تانگوں کے انتخاب نے رسوا کیا ہمیں''۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کوچوان برادری کا تعلق پسے (باریک + موٹا) ہوئے طبقے سے رہا ہے۔ یہ کوئی سی۔ایس۔ایس کلاس یا ڈی۔ایم۔جی گروپ نہیں ہے۔ ہینڈ ٹو ماؤتھ (ماؤتھ بھی دو) کا محاورہ ان پر اچھی طرح بل کہ بُری طرح صادق آتا ہے۔ یہ مراعات یافتہ طبقہ نہیں بل کہ ''مرات'' یافتہ ہے۔ ہم نے جب بھی تانگے میں سفر کیا، تانگے کی حالت کی بجائے کوچوان کی تنگ دستی اور اپنی تنگ دستی کے پیشِ نظر ہی کیا ہے۔ طرفین کی اقتصادی حالتیں باہم مل کر ہی اس شاہی سواری سے لطف اندوز ہونے کا باعث بنتی رہی ہیں۔

ہمارے ایک دوست ہمیں ہمیشہ نصیحتیں فرمایا کرتے ہیں ''تم اڈے پر پہنچ کر دو منٹ اپنے دماغ پر زور نہیں دے سکتے، تانگے اور گھوڑے کے منہ سے بندھا پھک کا توڑا دیکھ کر تمہارے منہ سے رال ٹپک پڑتی ہے۔ تانگے بھاگے نہیں جا رہے ہوتے۔'' ہم اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ ہمارا دماغ اتنا فالتو نہیں کہ تانگوں گھوڑوں کے شجرہ ہائے نسب پر صرف کریں۔ ہمارا دوست اتنا وہمی اور محتاط واقع ہوا ہے کہ جب اسے تانگہ کرانا مقصود ہوتا ہے تو وہ تانگے اور گھوڑے کا عمیق نظری سے مطالعہ کرتا ہے۔ کوچوان سے مکالمے کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے۔ ''بجن چلنا ہے؟'' ظاہر ہے بجن (کوچوان) رکنے کے لیے نہیں چلنے

کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ گھوڑے کے باپ دادے کے متعلق سوال بھی داغ دیتا ہے۔ بعض کوچوان اس قسم کے سوالات کی تاب نہ لاتے ہوئے ہمارے دوست کی سات پشتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تانگے کی لکڑی، اس کی بناوٹ اور اس کے چال چلن کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا ہے اور ساتھ ہی حلوے جیسے میٹھے لہجے میں کوچوان سے کہہ دیتا ہے ''تمہاری اور تمہارے گھوڑے کی دلآزاری مقصود نہیں۔ صرف دفع الوقتی کے لیے بات چیت کر رہا ہوں۔ اگر گھوڑا بول سکتا ہوتا تو ہمارا دوست ضرور اس قسم کے سوالات اس سے کرتا۔..........

تانگے کی ملازمت کب ارزانی ہوئی؟

پکے لاہوری ہو یا غریب الوطن؟

جلدباز ہو یا تحمل مزاج؟

انھی اوزان پر ہمارا دوست کوچوان کے عادات اور خصائل کے اسرار سے اس کی زبانی پردہ اٹھوانے کی کوشش کرتا ہے۔

تم خاندانی کوچوان ہو یا حادثاتی طور پر اس پیشے میں داخل ہوئے ہو؟

سگریٹ، حقہ کے علاوہ چرس یا افیون کے رسیا ہو یا نہیں؟

کتنی درجن سواریوں سے جی بھرتا ہے؟

اتنے سوالات تو شاید وہ بھی نہیں کرتا، جس نے تانگہ خریدنا ہو۔ ایک دفعہ ہم اپنے دوست کے ساتھ تانگوں کے اڈے پر ایک تانگے والے سے مذکورہ امور پر بحث و تمحیص کر رہے تھے۔ ہمارے دوست نے گھوڑے کے کان میں نہ جانے کیا جُملہ انڈیل دیا کہ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ہمارے دوست نے شاید اس کے لاشعور میں جھانکنے کی کوشش کی

تھی۔ وہ فرائیڈین انداز میں ہنہنایا اور مسکرایا۔

ہمارے دوست نے ایک دن زمانے کے نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے تانگے کی کھینچ تان اور اونچ نیچ پر نہایت کار آمد اور ٹرک آمد لیکچر دیا۔ ہم اس بات کا ادراک ہی نہیں رکھتے کہ کس تانگے میں بیٹھنا ہے۔ ہم ایسے تانگے کا انتخاب کر بیٹھتے ہیں کہ ہماری پسلیاں دکھنے لگتی ہیں۔ بعض لوگ اندھیرے میں موبائل کی روشنی میں گھوڑے کا منہ دیکھتے ہیں۔ اس کے نین نقش ملاحظہ کرتے ہیں حتّٰی کہ اس کے دانتوں تک کا معائنہ کرتے ہیں کہ یہ برش کرتا ہے یا مسواک۔ کہیں جانا پڑ جائے تو ہمارے تیار ہونے کا عمل اتنا طول پکڑ جاتا ہے کہ گھر والے ہماری تیاری سے تنگ آ جاتے ہیں۔ بیگم سے آنکھ بچا کر الماری سے باری باری شلواروں قمیصوں اور پتلونوں شرٹوں کو نکال نکال کر ان میں گھستے اور نکلتے ہیں۔ عین وقت پر 'نالے پانی' گم ہو جاتی ہے۔ کدھر گئی ''نالے پانی'' کی ہماری خوفناک آواز پر ہمارے بچوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ گھر کے کونوں کھدروں میں نالے پانی ایسے تلاش کرتے ہیں جیسے وہ کالے پانی چلی گئی ہو۔ جب بہت زیادہ وقت صرف کر کے ہم تانگوں کے اڈے پر پہنچتے ہیں تو کس کو اتنا ہوش رہتا ہے کہ تانگے گھوڑے کے چال چلن کا اندازہ کرے، اس وقت لاری اڈے پر گاڑی یا بس پکڑنے کی دُھن سر پر سوار ہوتی ہے۔

ایک دفعہ ہمیں کسی دوست کی شادی میں شریک ہونے کے لیے دوسرے شہر جانا تھا۔ صبح آٹھ بجے تیار ہونا شروع ہوئے۔ جینز، ڈریس پتلونیں، کرنڈی اور لٹھے کے سوٹ زیر بحث آ گئے اور ظہر کا وقت ہو گیا۔ بہر حال بھاگم بھاگ تانگے کے اڈے پر پہنچے۔ ایک تانگہ کھڑا تھا۔ پیچھے دو سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم جلدی میں ان سواریوں کے حدود اربعہ کا اندازہ نہ لگا سکے اور فوراً پچھلی سیٹ پر پہیے کی جانب بیٹھنے لگے۔ ابھی ہم بیٹھ ہی رہے تھے

کہ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے نیچے کوئی خالی جگہ نہیں، صرف گود ہے۔ ہم نے دوسرے پہیے کی جانب خالی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو میرے پورے جسم کو سہارا اور عزت دینے کے لیے دوسری گود منتظر تھی۔ ہم گوشت پوست سے بھری بھری گودوں اور دو بھرے بھرے گوڈوں پر اٹک گئے۔ کوچوان نے اپنے تانگے کے پچھلے حصے پر ایک بھاری سا پتھر بھی رکھ چھوڑا تھا۔ جونہی گھوڑا جھٹکے کے ساتھ چلا۔ ہم گوڈوں سے پھسل کر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ دوسری سواریوں نے کوچوان کو بلند آواز میں بتایا کہ ایک سواری پھسل گئی ہے۔ ہم پھر گوڈوں پر بیٹھے۔ سواریوں اور بھاری پتھر کے وزن نے تانگے کو نیچے سے سڑک بوس کر دیا تھا اور ہمیں ہر لحہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم تانگے سے اُتر رہے ہیں۔ ہم دو سواریوں کے گوڈوں پر صرف اپنی قوتِ ایمانی ہی سے اٹکے ہوئے تھے۔ اس اذیّت کا صرف ہمیں ہی علم تھا۔ گھوڑا، کوچوان اور دیگر سواریاں اس سے بے خبر تھیں۔ ہماری حالت اس شعر کے مطابق تھی۔

چلتا تانگہ دیکھ کے دیا کبیرا رو
دو پاٹن کے بیچ سلامت گیا نہ کو

سڑک کے پے در پے گڑھوں کے باعث جب تانگہ زیادہ ہی ہچکولے کھانے لگتا تو ہم اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتے اور بار بار لڑھک کر رہ جاتے۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ اگر ہمارے پاس رندہ ہوتا تو ہم ان سواریوں کے گوڈے چھیل کر ان کے درمیان پھنس کر بیٹھنے کی جگہ بنا لیتے۔ جس تانگے پر تم سفر کا عزم کرو اس کا گھوڑا کم از کم میٹرک پاس ہو۔ کیوں کہ میٹرک پاس گھوڑا چلتے چلتے دولتیاں نہیں جھاڑے گا۔ اس کی چال نہایت شریفانہ ہو گی۔ غرض یہ کہ وہ شترِ بے مہار یعنی اسپ بے لگام نہیں ہو گا۔ بعض گھوڑے اڈے پر تو ایسے

کھڑے ہوتے ہیں جیسے ان جیسا مہذب کوئی نہیں لیکن سواریوں کے بیٹھتے ہی ان کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر گھوڑے شاہ (دوموریہ پل سے آگے علاقے کا نام) کا مکین ہے تو وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا ہوتا ہے کہ اسے سواریاں بھی اسی علاقے کی ملیں، جہاں کا وہ جم پل ہے۔ آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ جونہی ایسے گھوڑے کے کانوں سے ''گھوڑے شاہ چلنا ہے'' کے الفاظ ٹکرائیں تو اس کے خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اس کا آبائی علاقہ اس کے خون میں خوشی کی لہر دوڑاتا ہے کہ وہ مستی میں آکر ایسی چال چلنے لگتا ہے جیسے وہ اس کرۂ ارض کو عبور کر جائے گا۔ صراطِ مستقیم پر چلتا ہے اور تیر کی مانند جاتا ہے۔ وہ گردن کو دو طرح جنبش دیتا ہوا گھڑ پن کے تمام تقاضے پورے کرتا جاتا ہے۔ وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف جھوم جھوم کر چلتا ہے کہ اسے شب و روز اس راستے پر چلنے کی عادت ہوتی ہے۔ ٹوئے بے، گٹر، نالیاں، پولیس کے سپاہی اور سڑک تمام نشیب و فراز اس کے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں۔ سڑک کے دائیں بائیں جتنی دُکانیں اور دکان دار ہوتے ہیں وہ اس کے لیے مانوس منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ حتّٰی کہ بعض دُکان داروں سے اس کا گھٹیا اور فحش مذاق بھی چل رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کو ناگفتہ بہ اشاروں سے بھی محظوظ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی دو منٹ میں بے عزتی خراب کر کے بھی رکھ دیتے ہیں۔ جونہی گھوڑے کی سماعتوں سے ''سمن آباد یا باغبان پورہ چلنے کے'' الفاظ ٹکرائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مزدوری کی بجائے اسے دوری ملی ہو۔ گھوڑا کوچوان اور سواریوں کے مابین ہونے والی گفت و شنید ہی پر آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ معاملہ طے ہوتے ہی اس کے تیور بگڑ جاتے ہیں۔ اس کے منہ سے اس طرح کے الفاظ برآمد ہوتے ہیں کہ یا مجھے گھوڑا نہ بنایا ہوتا یا گھوڑے شاہ کی طرف نہ چلایا ہوتا۔

کچھ نئے نئے رنگروٹ گھوڑے بھی ہوتے ہیں۔ سواریوں کو دیکھ کر ان کے سموں میں خارش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دوسرے علاقے کی اونچ نیچ اور سائیڈ ایفیکٹس سے بے خبر ہوتے ہیں اور دھوکے میں آجاتے ہیں مگر پکے پیٹھے سرد و گرم چشیدہ اور زمانہ ساز گھوڑے سواریوں کی چال اور بول چال سے ان کے علاقوں کو بھانپ لیتے ہیں۔ کوچوان جب گھوڑے کو اس کی منشا کے خلاف کسی علاقے کی طرف چلنے کا حکم دیتے ہیں تو ان کا ردِعمل اسی اڈے یا چوک پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ ایک دو قدم سواریوں کے لے کر چلتے ہیں اور پھر دو قدم ریورس ہوتے ہیں۔ کوچوان پہلے تو لگامیں کھینچ کر گھوڑے کا سلف مارتا ہے۔ گھوڑا کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوتا، وہ کوچوان کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا اور جلال میں آکر دائرہ میں گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ کوچوان گھوڑے کی اس حرکت کو اپنی شان میں گستاخی سمجھتا ہے اور گھوڑے کے سر پر لگام کا سراز ور سے دے مارتا ہے۔ سواریاں جو اپنی منزلِ مراد پر جلد پہنچنے کے خواب دیکھتے ہوئے تانگہ پر بیٹھی تھیں، گھوڑے کی اس انکاری کیفیت پر دائرے میں گھومنے لگتی ہیں۔ کوچوان نے گھوڑے کو سیدھا کرنے کی چابکانہ کوشش کی تو اس نے نہایت سست رفتاری سے دائرے میں گھومنا شروع کر دیا۔ کوچوان کے ہم عصروں نے گھوڑے کی اس گومگو کی کیفیت ختم کرانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ شاید گھوڑا یہ سوچ رہا ہو کہ مزدوری کے لیے تانگوں کا سودا کیا تھا، تبدیلیٔ علاقہ کا اشتہار نہیں بھرا تھا۔ گھوڑے کے چہرے سے اس کی بے زاری کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اس وقت یہ گھوڑا قریب قریب طائرِ لاہوتی کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا کیوں کہ اسے اس رزق سے موت اچھی لگ رہی تھی جو اسے اس کی مرضی کے خلاف کسی اجنبی علاقے کی سمت قدم بڑھانے سے حاصل ہونے والا تھا۔ ایسے گھوڑے نہایت اڑیل ہوتے ہیں۔ یہ ''کچھ لو، کچھ دو'' کے اصولوں سے

ناواقف ہوتے ہیں۔ان میں کچھ لچک نہیں ہوتی۔آخر ہم نے بار بار لڑھکنے کا یہ حل نکالا کہ جونہی تانگے کی رفتار مدھم ہوتی ہم تانگے سے اتر کر پیدل چل پڑتے۔(حقیقت یہ تھی کہ ہم تانگے پر چڑھے ہی کب تھے۔)اس طرح ہم نے تین میل کا سفر کیا۔جب ہم اپنے آپ کو اس تکلیف دہ کشمکش میں دیکھتے تھے تو گھوڑے کی قسمت پر رشک کرتے رہے کہ وہ کتنے مزے سے شاداں و فرحاں کئی انسانوں کا بوجھ لادے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ہم بیٹھے کہاں تھے، پل پل گرنے اور پھسلنے کی کیفیت میں مبتلا تھے اور گھوڑا ایک سوئی سے اپنی ذمے داری نبھا رہا تھا۔جس طرح ریڑھی سے فروٹ خریدنا ایک فن ہے، اسی طرح اڈے پر کھڑے تانگوں کے ہجوم میں سے کسی مناسب تانگے کا انتخاب کرنا بھی ایک فن ہے۔ہم جیسے بدھو اس بات کا ادراک ہی نہیں رکھتے کہ اگر انسانوں کی نفسیات کا مطالعہ کریں تو بعض انسان رومانی طبع کے مالک ہوتے ہیں۔ہم نے ایسے حضرات بھی دیکھے ہیں جو خواتین کو دیکھنے اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے خطرناک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔بعض اپنی دونوں آنکھوں کو الگ الگ خواتین دیکھنے پر مامور کر دیتے ہیں کہ یہ حضرات اہل طریقت کہلاتے ہیں۔یعنی یہ حضرات خواتین کو دیکھنے کے بہت سے طریقے جانتے ہیں۔ان کے برعکس بعض حضرات اتنے باحیا ہوتے ہیں کہ نگاہیں نیچی کر کے بلکہ بند کر کے چلتے ہیں۔وہ کسی کو نہیں دیکھتے خواہ مخالف سمت سے آنے والی خواتین ہی سے ٹکرا جائیں۔ایسی نفسیات کے حامل گھوڑے بھی پائے جاتے ہیں۔گھوڑوں کو اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لیے شیو نہیں کرنا پڑتی، انھیں اپنے بودے نہیں سنوارنا پڑتے۔ادائیگیٔ فرض کے معاملے میں گھوڑے نہایت ذمے دار واقع ہوئے ہیں۔یہ کولہو کے بیل کی طرح انسانی خدمت میں مگن رہتے ہیں۔یہ بڑے صالح اور نیکوکار قسم کے گھوڑے ہوتے ہیں۔اپنی نگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ناک کی سیدھ پر چلتے ہیں کیوں کہ ان کے پیشِ نظر عوامی خدمت کا ایک اعلیٰ تصوّر رہوتا ہے۔ دوسری طرف دل پھینک اور نظر باز قسم کے گھوڑے بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے تانگے میں جُتی انھیں کوئی پری چہرہ گھوڑی نظر آ جائے تو اپنی کنوتیاں کھڑی کر لیتے ہیں۔ جونہی گھوڑے نے پیار بھری نگاہوں سے گھوڑی کو دیکھا، وہ ہلکا سا مسکرا کر اور شرما کر رہ گئی۔ دونوں تانگے برابر چلنے لگے۔ گھوڑے کو اظہارِ محبت کا موقع مل گیا۔ میری پری کب تک شاد باغ سے بھاٹی لوہاری تک انسانوں کا بوجھ ڈھوتی رہے گی۔ میرے گھر میں بہت خوش حالی ہے۔ چارہ، گھاس، پھک چنے غرض اللہ کا دیا بہت رزق ہے۔ ساری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی۔ ان دنوں انسان بڑے سادہ ہوتے تھے۔ سیدھا سادھا عشق ہی کرتے تھے۔ اس میں الجبرا، جیومیٹری، فلسفہ اور نفسیات نہیں ڈالتے تھے۔ یہی کہ محبوب کو اس کے کوٹھے پر ننگے پاؤں چلتا دیکھ لیتے تھے یا محبوب کو چھت پر بوکر لگاتے دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ یعنی اس عشق میں جلیبی جتنے دل فریب اور آسمانی پنگھوڑوں کی طرح چکر بازیاں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ گھوڑے بھی سارا سارا دن تانگے کے آگے جُتے رہتے تھے اور انھیں فارغ وقت ملتا تو کسی میدان میں گھاس چرتے چرتے کسی مہنگائی کی ماری ہوئی گھوڑی سے رومانس بھری باتیں کر کے اپنا دل پشاوری کر لیا کرتے تھے۔ ہم نے کھیتوں اور باغوں میں گھوڑوں گھوڑیوں کو عشقیہ گیت گاتے سنا ہے۔ چلو دلدار چلو۔ چاند کے پار چلو۔

ایک زمانہ آیا جب ہم نے گھوڑوں گھوڑیوں کے چہروں پر اداسی دیکھی۔ کبھی شاد باغ کے گھوڑے گھوڑیاں اتنی خوش حال، فارغ البال اور بے نیاز ہوتی تھیں کہ اپنے پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ جونہی سواریاں خالی تانگے کی تلاش میں اڈے پر آتی سب تانگے لگے ہوئے ہوتے۔ خالی تانگے کی اصطلاح بڑی عجیب تھی۔ سواریوں کی عموماً

زبان پھسل جاتی۔ عموماً خالہ ٹانگی، ٹانگی خالہ یا خالہ تانگہ جیسے الفاظ منہ سے نکل جاتے تھے۔ خوش حالی اور فارغ البالی کے نشے میں گھوڑے گھوڑیاں سرشار رہتی تھیں۔ چاندگاڑی کے آجانے سے ان کا نشہ ہرن ہونا شروع ہوگیا۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر ہم نے خالی تانگوں کے گھوڑوں اور گھوڑیوں کو گردنیں موڑ موڑ کر سواریوں کو حریصانہ نگاہوں سے اپنی طرف متوجہ کرتے دیکھا ہے۔ ان کی آنکھوں میں گہری اداسی دیکھی ہے۔ چنگ چی نے ان کی دنیا اجاڑ کر رکھ دی ہے۔

گھوڑوں کو ڈیوٹی اوقات کے بعد تو عشق کرتے ہم نے بارہا دیکھا ہے لیکن بعض گھوڑے اتنے جلد باز اور بے صبرے ہوتے ہیں کہ اپنی ڈیوٹی کے دوران جب سڑک پر دونوں اطراف ٹریفک کے سیلاب، گاڑیوں کے دھوئیں اور شور نے مت مار رکھی ہوتی ہے۔ مخالف سمت سے آنے والے مونث تانگے ان کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ ہم ایک روز ایسے ہی بے صبرے اور ندیدے گھوڑے کے ہم سفر تھے۔ جب ہم تانگے پر بیٹھے تھے تو اس کا گھوڑا کافی مہذب، نیک اور صابر شاکر دکھائی دیا۔ ہم تانگے پر حسب معمول ہچکولے کھاتے منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ اس روز بارش کچھ اس انداز میں برسی تھی کہ سڑکیں کیچڑ میں لت پت تھیں۔ موصوف جونہی چوک ناغدا پر پہنچے، مصری شاہ کی طرف سے آنے والی گھوڑی تانگے کو دیکھ کے اپنے آپ میں نہ رہے۔ تانگے پر تین خواتین بیٹھی تھیں۔ گھوڑے نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ کوچوان نے اپنی خاص زبان اور سانٹے سے معاملے پر پانی ڈالتے ہوئے کہا ''شرم کرو'' اپنے ہی علاقے کی دھی بہن پر نظریں اٹھاتے ہو، ویسے بھی روزی کے اڈے کو چلا رہے ہو۔ اس گشتی رزق کے اڈے پر رحم کرو اور اپنا راستہ ناپو۔ گھوڑے کے بچے نے قسم کھائی تھی کہ وہ وہاں سے ایک قدم آگے نہیں بڑھے گا۔

ایک خاتون نے کوچوان سے پوچھا گھوڑا کیوں نہیں چلتا؟

دوسری نے فوراً جواب دیا ''گھوڑا پنکچر ہوگیا ہے''

تیسری نے آواز ملائی ''گھوڑے کا پٹرول ختم ہوگیا ہے''

ہم مرد بھی ان باتوں سے محظوظ ہونے لگے۔ گھوڑا عجیب خرمستیاں کرتا ہوا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا اور اپنی گردن کو گھٹیا عشق سے بھرپور جھٹکے دے دے کر ہلاتا تھا۔ ہم جب معلوماتی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں اس طرح کے سوالات مع جوابات درج ہوتے ہیں۔

ہوائی جہاز کس نے ایجاد کیا؟

''رائٹ برادران نے'' ہم اپنے تخیلات کے توسن پر سوار ہو کر سوچتے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑ کر جانے کا خیال ان بھائیوں کے ذہن میں کیسے آیا؟ ویسے جب چیل کوے ان بھائیوں کے سروں پر منڈلاتے ہوں گے تو ان کے دل میں ہوائی جہاز بنانے کی اُمنگ پیدا ہوئی ہوگی۔ رائٹ برادران کے نام سے ہمارا ذہن یہ سوچتے ہوئے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیتا ہے کہ کیا لیفٹ اور رائٹ کا چکر اس دور میں بھی ہوتا تھا یا پھر یہ بھائی صراطِ مستقیم پر چلتے تھے۔ ٹرین کے موجد نے چیونٹیوں کو ایک لمبی قطار میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے دیکھا ہوگا۔ کار کسی زیاں کار نے ایجاد کی ہوگی۔ بسوں، ویگنوں، ٹرک اور ٹریکٹر کے موجدوں کے نہ صرف نام کتابوں میں موجود ہیں بلکہ ان ایجادات کو دیکھ کر ان کے موجدوں کا ناک نقشہ یعنی ان کی شکلیں صورتیں بھی نگاہوں میں پھرنے لگتی ہیں۔ دوسری طرف ہم سے کوئی پوچھے کہ تانگہ کس نے ایجاد کیا تھا تو ہم بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ تانگے کے پیچھے کسی ترکھان یا مستری کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مانا کہ

ترقی کے لحاظ سے مغرب آسمان پر ہے اور ہم زمین پر، پرِ وہ بے پر کی دونوں چیزیں اُڑانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اگر ہم جہاز جیسی تیز چیز ایجاد نہیں کر سکے، کم از کم تانگہ تو ہمارے دیس کی پُرسکون اور سست ذہن کی پرواز کا نتیجہ ہے۔ اگر انگریز سنگِ مرمر ہے تو پتھر ہم بھی رکھتے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ از راہِ مذاق کوئی ہمارے تانگے کو دیکھ کر ہی یہ کہہ اٹھے:

''بھئی! تم نے یہ کیا حرکت کی ہے۔'' ہم جواباً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کی ہے۔''

ہم اگر غور کریں تو ہم نے مغربی موجدوں کے مقابلے میں نہایت ہی کم خرچ اور بے ضرر سواری ایجاد کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرنگیوں کو صاف الفاظ میں فرمایا تھا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

مغرب کی تہذیب تو خودکشی کر ہی رہی ہے، ان کے جہاز بھی اس کام میں پیچھے نہیں ہیں۔ تانگہ جتنا محفوظ ہے، جہاز اتنا ہی غیر محفوظ ہے۔ جہاز کریش ہو جائے تو کچھ نہیں بچتا، تانگہ کریش ہو جائے تو زین بھی پیار سے کہتی ہے ''بسم اللہ'' چیونٹی کا آٹا گر گیا ہے۔''

جب کوئی ہمیں یہ کہتا ہے کہ ہم ایک پسماندہ قوم ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے صبح سویرے دودھ دینے والے گوالے اور تانگے اور گھوڑے کی تصویر آ جاتی ہے۔ آئے روز یہ خبریں ہماری سماعتوں سے ٹکراتی ہیں کہ پائلٹ نے جہاز میں بیٹھتے ہی جب سلف مارا تو جہاز رن وے پر جوں کی رفتار سے رینگنا شروع ہو گیا۔ جونہی جہاز نے موڑ کاٹ کے متوازی رن وے پر شیر یا چیتے کی طرح دوڑنا شروع کیا کہ رن وے کانپ اُٹھا۔ مخالف سمت سے پرواز کرنے والی اس کی سگی دادی چیل نے اسے پر مارا تو جہاز زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کبھی پائلٹ کی آنکھ پر دھند پٹی باندھ دیتی ہے اور جہاز کسی پہاڑی

سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاز ایک خون خرابے والی ایجاد ہے اور سفرِ آخرت کا سوفی صد ہوائی ڈپو۔ ہم تو اپنی مشرقی زمینی سواری تانگہ کے طرف دار ہیں۔ اس میں شورِ قیامت برپا کرنے والا انجن نہیں ہوتا بلکہ اس میں نہایت مہذب انداز میں پھڑکڑے مارنے والا درویش صفت چار ٹانگوں والا انجن ہوتا ہے۔ اس کا سائلنسر ہونڈا کی طرح ہوتا ہے کہ اوپر بیٹھے سوار کو علم نہیں ہوتا کہ انجن اسٹارٹ ہو چکا ہے یا بند۔ کبھی کبھی گھوڑے کے پیٹ سے گیس خارج ہونے کی آواز سے پتہ چلتا ہے کہ وجد کرتا ہوا ناک کی سیدھ میں جا رہا ہے۔ سائنس کے کرشموں کی بدولت آج مرسڈیز، ہونڈا سوک، ہونڈا سٹی، ٹیوٹا کرولا، پراڈو، اور میٹسوبشی نامی کاریں سڑکوں پر دندناتی نظر آتی ہیں۔ ان کے انجن جاپان، جرمن اور امریکا میں تیار ہوتے ہیں۔ جب کہ تانگے کا انجن گھوڑی کے گھر جنم لیتا ہے۔ یہ انجن اس وقت بچھیرے کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ بچھیرے سے تانگے کا انجن گھوڑے کے منصبِ جلیلہ تک پہنچنے کے لیے اسے کوئی خاص تردد نہیں کرنا پڑتا بل کہ یہ اِدھر اُدھر اُگنے والی گھاس کھا کر اور کھیتوں میں منہ مار کر جوان ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر پھول کی قسمت میں خوب صورت عورت کا جُوڑا اور دولہے کے سہرے کی لڑیاں نہیں ہوتیں، اسی طرح ہر گھوڑے کے مقدر میں تانگہ نہیں ہوتا۔ یہ خدمتِ خلق سے سرشار ایثار پیشہ چند برگزیدہ سے گھوڑے ہوتے ہیں جو تانگے کھینچتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ انسان کے مقابلے میں ان کی ضروریات کم ہیں۔ انھیں کپڑے اور مکان کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن گھاس، چارے، چنوں اور پھک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا اس مخلوق کا ایثار دیکھئے کہ اس معمولی خوراک کے لیے نہ صرف اپنے جسم کے ساتھ کتنا بھاری اور وزنی تانگہ باندھ لیتی ہے بل کہ درجن بھر سواریوں کے بوجھ ڈھونے کا ذمہ بھی اٹھا لیتی ہے۔ ہم صبح چند قدم کے

فاصلے سے ایک کلو دودھ ڈول میں لاتے ہیں تو ہماری انگلیاں درد کرنا شروع کر دیتی ہیں لیکن گھوڑے کے حوصلے اور اس کی ہمت کا اندازہ کیجیے کہ نہایت نشاستہ دار اور چربیلی سواریوں بھرا تانگہ ہانپ ہانپ اور ہمک ہمک کر کھینچتا رہتا ہے لیکن حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ تو بات ہو رہی تھی کہ ہماری یہ مشرقی سواری نہایت محفوظ ہے۔ گھوڑا تانگے کے قوانین اور اس کی پابندیوں سے اپنی گردن باہر نہیں نکال سکتا۔ کبھی گھوڑے نے بادلِ نخواستہ ان پابندیوں اور قوانین سے روگردانی کرتے ہوئے کوئی غلط قدم اٹھا لیا تو زیادہ سے زیادہ اتنی حرکت کی کہ سڑک پر چلنے کی بجائے سڑک سے نیچے اُتر گئے۔ نیچے اُترتے ہوئے تانگے پر براجمان سواریوں کے وزن سے تانگے کی رفتار بے حد تیز ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ کوچوان گھوڑے کی لگامیں تھامے اتنی رفتار سے بھاگتا دکھائی دیتا ہے کہ اس کا تہمد ٹانگوں سے ہٹ جاتا ہے اور چھ ٹانگیں بھاگتی نظر آتی ہیں۔ تانگے میں بیٹھنے والی عورتیں اور مرد گھوڑے کے اس اچانک آزادانہ فیصلے پر خوف زدہ نہیں ہوتے بلکہ وہ اس سچوایشن کو خوب انجوائے کرتے ہیں۔ جہاز اگر اس طرح کا فیصلہ کر لے تو سواریوں کا سفر اگلے جہان کے سفر میں بدل جاتا ہے۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھوڑا کوچوان کی کسی سرزنش کا بُرا مان جاتا ہے۔ گھوڑے نے وقتی طور پر بات برداشت کر لی جب تانگہ بھر گیا تو گھوڑا سواریوں سمیت مٹھائی کی دکان میں گھس گیا۔ یہاں مٹھائی کے بڑے بڑے تھال زمین پر گر گئے۔ شوکیس بھی ٹوٹ گیا۔ سواریاں اپنی ٹانگوں پہ ٹانگیں دھرے مزے سے بیٹھی گھوڑے کے اس یو (U) ٹرن پر آیت الکرسی پڑھنے لگیں۔ گھوڑا کیا اس کا ایکسرا تھا، اب تمام سواریوں نے یکے بعد دیگرے گھوڑے کی صحت کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ ایک صاحب نے کہا "ایسے لگتا ہے جیسے گھوڑا گھاس چارہ کھانے کی

بجائے غم ہی کھاتا ہے۔" اس کی ایک ایک پسلی پر اس کے دکھوں اور غموں کی داستان پڑھی جاسکتی ہے۔ایک سواری نے کہا کہ ہم جس رفتار سے جا رہے ہیں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کہیں نہیں جا رہے۔آگے سڑک کے کنارے ایک بورڈ نصب تھا جس پر لکھا تھا "آہستہ چلیں" ایک سواری نے کوچوان سے کہا۔کم ازکم یہ شرط تو پوری کریں۔ جب ہم پرائمری کے طالب علم تھے تو اپنے ہم جماعت طلبہ کے اشغال پر گہری نظر رکھتے یعنی وہ خلوت اور جلوت میں کیا کرتے ہیں۔ ہمارے ایک ہم جماعت منہ اندھیرے گاؤں سے باہر قبرستان میں جا کر مالش کرتے اور سینکڑوں ڈنڈ بیٹھکیں نکالتے۔ایک دن ہم ان کی خلوت کا اندازہ لگانے کے لیے ڈرتے ڈرتے قبرستان پہنچے تو دور سے اندھیرے میں یوں دکھائی دیے جیسے کوئی مردہ کفن اتار کر ورزش کر رہا ہے۔ہمیں اچانک خوف محسوس ہوا کہ کہیں ہم بھی کسی قبر میں نہ دھر لیے جائیں۔ہم نے اپنے دوست کے تھرکتے بدن کا دور سے نظارہ کیا کہ

شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رسوا کرنا

دوستوں کے اشغال کے علاوہ ہمیں جانوروں کے شغل اشغال سے واقفیت حاصل کرنے کی کرید ہوتی تھی۔ ایک روز ہم نے ایک بچھیرے کو دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے گرد کپڑا لپیٹا گیا تھا۔ایک شخص نے بچھیرے کے گلے میں ڈالے گئے رسے کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور بچھیرا دائرے میں تیز تیز چکر لگا رہا تھا۔ہم نے اپنے ماموں سے پوچھا کہ گھوڑے کا بچہ بلا مقصد چکر کیوں لگا رہا ہے۔ ہمارے ماموں جان نے بتایا کہ جس طرح تم اپنے سکول میں ماسٹروں کے ڈنڈوں اور ان کی لاتوں کے ذریعے عملی زندگی کے لیے تیار ہو رہے ہو، اسی طرح یہ بچھیرا اس ڈرائیونگ اسکول کا طالب علم ہے اور عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لیے چکر لگا رہا ہے۔ جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو ہم نے بہت سے

پھیروں کو دیکھا کہ ان کا خون گرم تھا اور ان کے دل میں انسانیت کی خدمت کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ انھوں نے تانگہ چلانے کا شریفانہ پیشہ اختیار کیا حالانکہ پھیروں کو عشق و عاشقی کے لیے وسیع کھیت میسر تھے۔ جس طرح پبلک سروس کمیشن کے ذریعے طلبہ سول سروس کے حصول کے لیے امتحانات دیتے ہیں، اسی طرح گھوڑے بھی باعزت زندگی بسر کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو معاشرے کا اہم رکن بنانے کے لیے پبلک سروس تانگہ کے حصول سے قبل اپنی آنکھوں پر کھوپے لگا کر خوب چکر لگاتے ہیں۔ جہاں بھی کوئی گھوڑا باعزت روزگار کے لیے دائرے میں چکر لگا رہا ہو، مشتاقانِ دید کا ایک ہجوم عوامی خدمت سے سرشار گھوڑے کی نیک چلنی کی داد دینے کے لیے دائرے میں کھڑا نظر آتا ہے۔

وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ لاہور میں ہر طرف تانگوں کی گنگا بہتی تھی اور عام آدمی بہت کم پیسوں کے عوض اس بہتی گنگا میں ہاتھ پاؤں دھو سکتا تھا۔ اک موریہ پُل تانگوں کی جائے اقامت اور گھوڑوں کی جائے اجابت تھی۔ یہاں داتا دربار کی طرف سے آنے والے پھل دار تانگے آ کر رکتے۔ بچے ان تانگوں سے انگور کی طرح لٹکے ہوتے۔ اسٹیشن اور لاری اڈے سے شاد باغ منزلِ مراد کی طرف جانے والے تانگے بھی اسی پُل کے نیچے سے گزرتے تھے۔ یہاں تانگوں کے پرستار سروں پر گٹھڑیاں، ہاتھوں میں سبزیوں کے تھیلے توڑے اور دیگر ساز و سامان لیے کھڑے نظر آتے۔ کوچوان حضرات نہایت ہوا دار لباس پہنا کرتے تھے۔ یعنی تہمد یا دھوتی۔ ان کے اوپر بٹنوں سے آزاد سلوکا یا صرف پیٹ ہوتا، سر پر منڈاسا ہوتا جو تیز دھوپ، پولیس کے ڈنڈے، دھول دھپے سے بچنے اور ہاتھ صاف کرنے کے لیے باندھا ہوتا۔ یہاں کوچوان اپنے اپنے تانگے کا مزا چکھانے کی پیش کش کرتے۔ سواریاں یہاں مچھلیوں کی طرح دکھائی دیتیں جنھیں پکڑنے کے لیے کوچوان

مختلف حربوں کے جال پھینک رہے ہوتے۔

کیا آپ نے تانگہ دیکھا ہے۔اس پر سواری کی ہے؟،سواری نہیں کی تو کبھی اس کے پائیدان پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوئے ہیں اور کوچوان سے سانٹا کھایا ہے۔

ڈیک پر لگے اس گانے کی آواز آنا شروع ہوگئی

''سوچا تھا پیار نہ کریں گے۔''

لیکن عورتوں کی جانے بلا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ایک عورت بولی

''یہ بدتمیزی کیوں کر رہا ہے،اسے ناشتہ نہیں کرایا تھا؟''

کوچوان نے سرگوشی کے انداز میں گھوڑوں گھوڑیوں کے اس کو ایجوکیشن نظام پر گرما گرم تبصرہ شروع کر دیا۔ اس نے کہا۔ شاد باغ سے لے کر بھاٹی دروازے تک گھوڑیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر قدم پر بے پردہ گھوڑیاں گھوڑوں کے زہد و تقویٰ کا امتحان لیتی دکھائی دیتی ہیں۔

ہزاروں گھوڑیاں ایسی کہ ہر گھوڑی پہ دم نکلے

بعض گھوڑیوں پر تو انڈین ایکٹریسوں کا گمان ہوتا ہے۔ جب بریک ڈانس یا بیلے ڈانس کرتی ہوئی چلتی ہیں تو گھوڑوں کے دلوں پر چھریاں چلتی ہیں۔

بعض گھوڑے روزی کمانے گھر سے نہیں نکلتے بلکہ وہ مختلف علاقوں کی گھوڑیوں کو تاڑنے کے لیے سڑک نوردی کرتے نظر آتے ہیں۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ گھوڑوں گھوڑیوں کی اس مخلوط سڑک کا سدِ باب کرے اور ان کے الگ الگ روٹ متعین کرے۔

اس گھوڑے نے کوچوان کے سانٹے کی زبان کیا سمجھنا تھی، اس نے آناً فاناً اپنی

دونوں ٹانگوں کو اوپر اٹھایا۔ پچھلی نشست والی سواریاں جن میں ہم بھی تھے۔ سڑک پر دھڑام سے گر پڑیں۔ ہم کیچڑ میں لت پت ہو کر نیم بے ہوش سے ہو گئے۔ ایک دو منٹ بعد ہمارے منہ میں کیچڑ بھرا سانس جاری ہوا تو ہم فوراً زقند لگا کر تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ تانگہ جب خراماں خراماں چلنے لگا تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہماری دنیا بدل گئی ہے اور تانگے پر بیٹھے الٹے جا رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ تانگے سے گرنے کی وجہ سے شاید ہمیں چکر آ رہے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ دکانیں دوبارہ شروع ہو گئی ہیں جو تھوڑی دیر قبل گھوڑے کے رومانی دورے سے پہلے دیکھی تھیں۔

ہمارے اوسان بجا ہوئے تو معلوم ہوا ہم جلدی میں گھوڑی والے تانگے پر سوار ہو گئے تھے۔

ہمارے ہاں تانگہ وہ واحد سواری ہے جس کا چالان کرتے ہوئے محکمہ بے رحمی بھی رحم کھاتا ہے اور پولیس بھی گھبراتی ہے۔ کیوں کہ تانگے کو اگر تھانے لے جا کر بند کر دیا جائے تو پولیس والے گھوڑے کی ٹہل سیوا کرتے کرتے ''پھانویں'' ہو جائیں۔ پھر تانگہ چلانے کے لیے عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ بچہ پیدا ہوتے ہی گھوڑے کی باگ تھام لے تو پولیس کو کوئی اعتراض نہیں۔ ہمیں کوچوانوں سے کوئی شکوہ نہیں۔ بس انھیں ہم صرف یہ مشورہ دینے کی جسارت کرتے ہیں کہ ایک تو وہ تانگہ چلاتے ہوئے اپنا قومی لباس شلوار قمیص زیب تن کیا کریں اور دوسرے گھوڑوں کے بول و براز کی سخاوت عام کرنے کی بجائے اس کے انتقال کا معقول انتظام کریں۔

بسیں اور بے بسی

بس سے مراد چار یا چھے پہیوں والی ایسی موٹر گاڑی ہے، جو مسافروں کے انتقال کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ہماری لوکل بسیں اپنی مرضی کی آپ مالک ہیں، ان پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ ان بسوں میں سواری کرنا اتنا معیوب نہیں، جتنا ان کے انتظار میں بے بس ہونا۔ بس کے انتظار میں کھڑی ہونے والی سواریوں پر خشک موسم میں ایک تو آتی جاتی گاڑیوں کی دھول بہت پڑتی ہے۔ دوسرے، بارش کے روز ان کے کردار پر کیچڑ بھی بہت اچھالا جاتا ہے۔ بسوں کو لاکھ بُرا کہہ لیں، یہ پھر بھی رکشے اور ویگن سے بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ ویگن سے تو خدا بچائے کیوں کہ یہ ایسی سواری ہے جو بندے کو نہ صرف غیر کے آگے جھکا دیتی ہے بل کہ اس کی ہڈیوں، پسلیوں اور جوڑوں میں درد بھی شروع ہو جاتا ہے۔ رکشہ میں بیٹھ کر آدمی سیدھا جنت کو سدھار جاتا ہے کیوں کہ اس میں رکشہ ڈرائیور کے علاوہ اس کی ماں کی دعا بھی شامل ہوتی ہے۔

آپ لاری اڈے چلے جائیں۔ وہاں آپ کو فقیر کچھ اس قسم کی دعا دیں گے۔ ''تو پُتر پرائیویٹ بس تے سفر کر رہیاں اے، اللہ تینوں خیر خیریت نال تے صحیح سالم لے جاوے۔'' یہ دعا سنتے ہی بندے کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے بسوں کی ڈے اینڈ نائٹ سروس کا مطلب ہی سواریوں کو سفرِ آخرت پر بھیجنا ہے۔

آپ اپنے اٹیچی کیس یا بیگ کے ساتھ جھولتے جھولتے چل رہے ہوں گے کہ آپ سرخ سرخ آنکھوں والے ہیلپر زادوں کی زد میں آجائیں گے۔ نہ جانے ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار ہوتا ہے یا سواریوں کے لالچ کی سرخی۔ بہرحال ان میں ایک چیز ضرور ہوتی ہے۔ ہیلپروں کے کُرتے اتنے طول پکڑ چکے ہوتے ہیں کہ ان کی شلواروں کو کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا ہوتا۔ آپ کو ایک ہیلپر زادہ صدقِ دل سے صادق آباد کی بس میں بٹھانا چاہے گا اور دوسرا فیصل آباد لے جانے کا فیصلہ کر چکا ہوگا، جب کہ آپ قصور جانے کا قصد کر رہے ہوں گے۔ پرائیویٹ بسوں کے ان ہیلپر زادوں کے پرائیویٹ جذبے پر حیرانی ہوتی ہے۔ بندے کو ان سے رہائی پانے کے لیے غالب کا یہ مصرع سنانا پڑتا ہے۔

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟

یہ بھی عام مشاہدے کی بات ہے کہ میاں بیوی اور ان کا بچہ مع ساز و سامان اگر بسوں کے اڈے پر پہنچ جائیں تو اسی لمحے ایک بس کا کنڈکٹر بیوی کے ہاتھوں سے بچہ اٹھا کر بھاگ جائے گا، دوسرا کنڈکٹر سامان اور تیسرا بیوی کو۔ ایک خاندان کو مختلف شہروں کی بسوں پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اب یہ خاوند کی پھرتی پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلدی اپنے بکھرے ہوئے خاندان کو یک جا کرتا ہے۔

بسوں کے اڈے پر کنڈکٹر اور ہیلپر ہر شخص کے کندھوں، ہاتھوں اور عزمِ سیاحت پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ہیلپر کسی سواری پر ضرورت سے زیادہ وقت ضائع کرے تو کنڈکٹر اسے فوراً کہتا ہے ''تم بزنس کر رہے ہو یا رشتے داری؟'' اس طرح ہیلپر سواری کو اسی کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

چمن سے گُل اگر رخصت ہوا، نرگس تو باقی ہے

شاید وہ پیچھے آنے والی سواری نرگس کی طرف بڑھتا ہے۔ بسوں کے قریب تو روزِ محشر کا سا سماں دکھائی دیتا ہے۔ مگر روزِ محشر تو فرشتے اپنی گُرزوں کے ذریعے بندوں کی قطاریں بنوائیں گے۔ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکے گا کہ میرا حساب پہلے لے لیجیے، میں نے ابھی بجلی کا بل جمع کرانا ہے یا گوالے سے دودھ وغیرہ لانا ہے۔ اگر آپ ہفتے کے رش سے بچنے کے لیے جمعہ کو اڈے پر پہنچ گئے تو وہاں پہنچ کر پتا چلے گا کہ سب نے جمعہ ہی کو ہفتہ سمجھ لیا ہے۔

جمہوریت میں تو بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے لیکن لاری اڈے پر بندوں کو گننے کے ساتھ ساتھ انھیں ان کے سامان سمیت نہ صرف تولا جاتا ہے بل کہ انھیں بسوں کی چھت پر بھی بٹھا دیا جاتا ہے۔ امیدوار آستین چڑھائے اور سروں پر کفن باندھے دروازے کی بجائے کھڑکیوں کے ذریعے بس میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ تہمد اور دھوتی پہننے والوں کو جلد بازی اور حرص و ہوا زیب نہیں دیتی، اس لیے پہلے وہ دھوتیوں کو لنگوٹ میں بدلتے ہیں اور پھر خلوص اور نیک نیتی سے دوسروں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

سواریاں بڑے خلوص سے بس میں سوار ہو کر درد کی دولت کو عام کرتی ہیں۔ پہلے والی سواریاں اپنے باز و وا کیے ہوئے گلے ملنے کی دعوت دیتی ہیں۔

عید کا دن ہے، گلے ہم کو لگا کر ملیے

بس کے اندر پہنچ کر تمام سواریاں ایک دوسرے میں دھنس جاتی ہیں۔ ایک جوڑ دوسرے جوڑ میں فٹ ہو جاتا ہے۔ یہی سوچل انڈر سٹینڈنگ من تو شدم تو من شدی کی

طرف لے جاتی ہے اور سب نظریۂ ضرورت اور نظریۂ وحدت الوجود کے دھاگے سے بندھ جاتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نہ تو کوئی پنجابی ہے، نہ سندھی، نہ بلوچی اور نہ کوئی پٹھان، حتّٰی کہ نہ کوئی انسان ہے۔ یہ سب ایک ہی بس کے سوار ہیں اور پاکستانی ہیں۔ جب سب سواریاں ایک دوسرے کی شہ رگ سے بھی قریب ہو جاتی ہیں تو ان کے سانس اس بات کی غمازی کر رہے ہوتے ہیں کہ انھوں نے صبح سری دیوی کا ناشتہ کیا تھا یا کسی زبان دراز بکری کی مادری زبان کا۔ جن سواریوں نے اپنی پتلونوں یا شلواروں کی کریز بنانے کی خاطر صبح قومی وقت کا ضیاع کیا تھا۔ اب بس میں سوار ہونے کے بعد اجتماعی کوششوں کی بدولت ان کی پتلونوں کی کئی کریزیں نکل آئیں حتّٰی کہ یہ کریزیں یوں نظر آنے لگتی ہیں، جیسے پاکستانی نقشے میں پنجاب کے پانچ دریا ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی شکل میں پنجند کے مقام پر گرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جب بس میں بہت سے آدم زاد سوار ہو جاتے ہیں تو نو وارد کے لیے ان میں سے گزرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ہاتھ پاؤں مار کر آگے پیچھے سرکنا چاہے تو اس کی شلوار اور قمیص کے کچھ حصے دوسروں کے قبضۂ قدرت میں ہوتے ہیں۔ بعض اوقات بندے کی ٹانگیں سواریوں کے ایک گروپ میں اور سر دوسرے گروپ میں شامل ہوتا ہے اور اس کی چپل پوری بس کا ایک چکر مکمل کر لیتی ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ جہاں قوم صوبائی تعصب، لسانی گروہوں اور فرقہ وارانہ زیادتیوں کا شعار ہو وہاں یگانگت اور بھائی چارے کے ایسے چند لمحات بھی غنیمت ہوتے ہیں۔ ایک صوبے کی سواری کے ہونٹ دوسری صوبے کی سواری کے گال پر پیوست ہو جاتے ہیں، اس طرح ایک صوبے کو دوسرے صوبے کی گرمی اور محنت کے پسینے کا ذائقہ بھی

معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک دوسرے کی دستی کوششوں سے سر کی مانگیں بھی خراب ہو جاتی ہیں۔ جیب اور پیٹ کے راز بھی ایک دوسرے پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ پشاوری چپل مکیشن پر غالب آجاتی ہے اور ملتانی کھُسہ باٹا کے بُوٹ پر سوار ہو جاتا ہے۔

ہماری بسوں میں بعض اوقات بڑے نازک مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر دو سواریوں کے بیچ بندے کا ہاتھ پھنس جائے تو لامحالہ اسے اپنا ہاتھ واپس لانا پڑے گا۔ ایسے میں کسی سواری کا کمر بند بھی ساتھ ہی چلا آتا ہے۔ ہجوم میں کوئی صاحب اگر اپنے جسم کے کسی حصے کو کھجلانے کے متمنی ہوں تو عین ممکن ہے کہ جب ان کا دستِ مبارک اس مقام تک رسائی حاصل کرے، دوسرا فوراً ہوشیار ہو جائے۔ آپ بھی بڑی بڑی مجبوریوں سے دوچار ہوئے ہوں گے لیکن ذرا سوچیے! آپ کی گردن پر خارش ہو رہی ہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ اسے ریگ مال سے کھجلائیں اور حظ اٹھائیں لیکن کوئی آپ کو یہ حق استعمال ہی نہ کرنے دے تو......

اگر کوئی موٹی اسامی کسی سیٹ پر بیٹھ جائے تو دوسری سواری کا سفر بار بار سیٹ پر اٹکنے ہی کی وجہ سے اکارت چلا جاتا ہے۔ نہ اس سے اٹھا جاتا ہے اور نہ بیٹھا جاتا ہے اور اس درمیانی کیفیت کا وہ کسی سے اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ اونچے قد کے لوگوں کو اپنا قد گھٹانا پڑتا ہے اور پست قد سواریوں کو بس کے ڈنڈے کے ساتھ جھولنا پڑتا ہے۔

ہماری بسوں کے ڈرائیور اپنی بسوں کو سپردِ خدا کر کے چلاتے ہیں۔ یہ بسیں کبھی سیدھی نہیں چلتیں بلکہ پوری سڑک پر مٹکتی، مچلتی، مچکتی، لہراتی اور بل کھاتی ہوئی چلتی ہیں۔ گدھیں اور چیلیں ہمارے ڈرائیور حضرات کا بہت شکریہ ادا کرتی ہیں کیوں کہ ان کی

تیز رفتاری سے انھیں ناشتے، لنچ اور ڈنر میں شیر کی خالہ، سگِ آوارہ یا بھیڑ بکری وغیرہ کا گوشت بآسانی مل جاتا ہے۔ بعض اوقات تیز رفتاری غریب سواریوں کے دن بھی پھیر دیتی ہے۔

جب بس نیچے سے اوپر تک سواریوں سے مالا مال ہو جاتی ہے تو ڈرائیور ٹیپ بھی آن کر دیتے ہیں۔ انجن کے شور میں مادام نور جہاں کی آواز کا جادو سر چڑھ کر تو نہیں بولتا لیکن بس رُکتے ہی یہ بول صاف سنائی دیتے ہیں۔

ساری دنیا دو دو ہو گئی، میرا تن اے کلا

علم انسان کو بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ ہمارے طلبہ کو اپنے اندر ایسی خوبیاں پیدا کرنی چاہییں کہ وہ واقعی اشرف المخلوقات نظر آئیں۔ وہ ایسا کرنے کی روزانہ ہی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً جسمانی تعلیم کا روزانہ ایک پیریڈ ان کا بسوں ہی میں ہو جاتا ہے۔ کنڈکٹر ایک ایسا کیریکٹر ہوتا ہے، جس کے لیے ابھی تک طلبہ کی آنکھوں میں احترام کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ شاید نوجوان نسل کنڈیکٹر کے حقیقی مقام و مرتبے سے آشنا نہیں۔ طلبہ کے دل میں بسوں میں مفت سفر کرنے کی جو چنگاری سلگتی رہتی ہے، یہ کسی بھی سٹاپ پر بھڑک اٹھتی ہے اور پھر اللہ دے اور بندہ لے! علامہ اقبال نے طلبہ علی گڑھ کے نام، ایک نوجوان کے نام اور ایک فلسفہ سیّد زادے کے نام جیسی عظیم نظمیں لکھی ہیں۔ اگر وہ ایک نظم ''بسوں میں مفت سفر کرنے والوں کے نام'' بھی لکھ دیتے تو طلبہ اور ٹرانسپورٹروں کے تعلقات اس حد تک کشیدہ نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ ہمیں ایک بس پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک سٹاپ سے پہلے ڈرائیور نے کنڈکٹر کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ کنڈکٹر دروازے ہی میں معلق تھا۔ اس نے فوراً ایک سیٹ

کے نیچے سے ایک بڑی سی لکڑی نکالی۔ ہم سمجھے کہ شاید کوئی مسافر اپنے ساتھ لکڑی لے کر جا رہا ہے۔ کنڈکٹر نے وہ لکڑی دھڑام سے بس کے پچھلے ٹائروں کے آگے پھینک دی۔ ایک زوردار جھٹکا محسوس ہوا۔ بس کی رفتار قدرے کم ہوگئی۔ کنڈکٹر نے ایک اور بڑی لکڑی پچھلے ٹائروں کے آگے پھینکی۔ جھٹکا لگا۔ بس کی رفتار کچھ اور کم ہوگئی۔ اب کنڈکٹر باقاعدہ نیچے اتر گیا۔ اس نے دونوں لکڑیوں کو پھرتی سے اٹھایا اور بھاگ کر باری باری پچھلے ٹائروں کے آگے پھینکنے لگا۔ بریکیں لگانے کا یہ انداز اتنا اچھوتا اور منفرد تھا کہ ہر سواری کے منہ پر ''الحفیظ'' اور ''الامان'' کے الفاظ تھے۔ ہم یہ بات دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بریکیں لگانے کا یہ طریقہ دنیا کے کسی ملک میں رائج نہیں۔ اگر کوئی ملک یہ طریقہ اپنانا چاہے تو وہ پہلے ہمارے ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں سے باقاعدہ اجازت لے لے۔

❀❀❀

موٹر سائیکل

یوں تو ہم نے اپنے کیریئر کا آغاز پیدل چلنے سے شروع کیا مگر پیدل چلنا جب کار رکھنے سے بھی مہنگا پڑا تو ہم نے کیریئر والی سائیکل خریدلی۔ ہم دل کے کچھ ایسے سخی واقع ہوئے تھے کہ تمام اہلِ محلہ اور ہم جماعتوں سے کہ دیا تھا کہ بھئی! یہ سائیکل دراصل تم لوگوں کی ہے۔ ہمارا تو اس میں اتنا ہی دوش ہے کہ صرف خریدی ہے اور فارغ اوقات میں ہمارے گھر میں کھڑی رہا کرے گی۔ ویسے بھی ضرورت کی چھوٹی چھوٹی اشیاء کے لین دین سے دلوں کی کدورت وغیرہ دُھل جایا کرتی ہے۔ ویسے اس کا گھسے گا بھی کیا؟ لوہے کی تو ہے۔ لوگوں نے ہمارے تھوڑے کہے کو بہت جانا اور صبح دوپہر اور شام ہمارے دروازے پر دس تک اور بیس تک دوہتڑوں کی بارش ہونے لگی۔ ہم دروازے کی ہر کھٹکھٹاہٹ پر دبے پاؤں اُٹھتے اور سائیکل نکال کر سائل کو دے دیتے۔ ہمارے والد صاحب کو ہمارا حاتم طائی ثانی بننا پسند نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کرائے پر سائیکل دینے والے شام سات بجے کے بعد بہت احتیاط کرتے ہیں لیکن ہمارے دروازے اور سائیکل کا تالا ہر کسی کے لیے رات بارہ بجے تک کھُلا رہتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں اس عفیفہ کو جوڑوں کا درد رہنے لگا تھا۔

ویسے تو سائیکل کے بین الاقوامی حقوق چین، ادیبانہ حقوق بُطرس بخاری اور

غریبانہ حقوق عام آدمی کے نام محفوظ تھے، اس لیے سوچا کہ موٹر سائیکل ہی خرید لی جائے۔ ایک صاحب تھے، ان کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ ایک دن ہم نے ان سے تذکرہ کیا کہ کیا ایسی کوئی صورت نکل سکتی ہے کہ آپ والی موٹر سائیکل ہم چلالیا کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کے موٹر سائیکلانہ جذبات کی قدر کرتے ہیں اور آپ سے صرف مبلغ تین ہزار روپے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم نے انھیں کہا کہ آپ کچھ تو کم کریں، چلو زیادہ نہ سہی، صرف تین ہزار کم کرلیں، باقی رہا موٹر سائیکل چلانے کا مسئلہ تو اس کی آپ فکر نہ کریں، ہم کسی نہ کسی طرح چلالیا کریں گے۔

انھوں نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا کہ ''آپ نے جو کچھ کہا ہے، یہ اس کیفیت کا ردِ عمل ہے، جو پیدل چلنے سے وقتاً فوقتاً آپ پر طاری ہوتی رہی ہے۔''

''جناب! آپ نے اسے جتنا چلایا ہے، اس سے آگے وہ چل ہی نہیں سکتی تھی۔''

''آپ تو ایسے کہ رہے ہیں، جیسے میں یہ موٹر سائیکل موت کے کنوئیں میں چلاتا رہا ہوں۔ اب بھی اتنی فرماں بردار ہے کہ پہلی کِک پر سٹارٹ ہوجاتی ہے۔''

بہرحال ہم نے تین ہزار روپے جمع کرنے کی مہم شروع کردی۔ جن رشتے داروں کے ہاں ہم زندگی بھر کبھی نہیں گئے تھے، ان کے در پر بھی ہزار بار جانا پڑا۔ ہم نے رشتے داروں سے کہا کہ آج تک ہم آپ کی خدمت میں اس وجہ سے نہیں حاضر ہوسکے کہ ہمارے پاس موٹر سائیکل نہیں تھی۔ اب اِن شاء اللہ آپ کے مالی تعاون سے ہم موٹر سائیکل خریدلیں گے اور آپ کے دُکھ سُکھ میں بروقت شریک ہوا کریں گے۔ موٹر سائیکل ہمارے

حواس پر اس قدر چھا گئی کہ ہمیں نماز میں بھی موٹر سائیکل کے متعلق اس قسم کے خیالات آنے لگے...... راستے میں اگر کوئی ضعیف العمر یا معذور شخص دیکھوں گا تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا کروں گا! گھر والی شرط ذرا سخت ہے، صرف بس سٹاپ تک!'' موٹر سائیکل کو روزانہ دو مرتبہ سرف سے دھویا کروں گا اور بارش کے روز اسے گھر سے نہیں نکالا کروں گا! وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز ہم اپنے ایک تجربہ کار ماہرِ موٹر سائیکلیات دوست کو لے کر اس شخص کے دولت خانے پر پہنچے، جس سے موٹر سائیکل خریدنی تھی۔ موٹر سائیکل کے مالک نے اپنے برادرِ خورد سے کہا کہ وہ بائیک کو اہلِ خانہ کے آخری دیدار کے لیے صحن میں کھڑی کر دے۔ ہم نے مالک کا چہرہ دیکھا تو یوں محسوس ہوا، جیسے وہ موٹر سائیکل کے گلے میں بانہیں ڈال کر زور زور سے رو دے گا۔ آخر کہنے لگا۔ ''جس چیز سے روز روز کا واسطہ ہو، اس سے لامحالہ اُنس تو ہو ہی جاتا ہے۔ آپ کبھی کبھار مجھ سے ملاتے رہیے۔ اس کا مکینک اور پٹرول پمپ ''مستقل'' ہے۔

ہم نے موٹر سائیکل کو غور سے دیکھا تو وہ لیڈی سائیکل کی فرسٹ کزن نظر آئی۔ پہلے تو اس کا سودا کرنا ہی ہمیں اپنی مردانہ وجاہت کے خلاف لگا۔ پھر اس کے مالک نے خود ہی بتا دیا کہ بابو جی! گو اس موٹر سائیکل کو جاپان میں زنانیاں ہی چلاتی ہیں مگر ہمارے ہاں اسے ''زنانے'' بھی چلا سکتے ہیں۔ ہم نے اس جملے کو بڑا انجوائے کیا۔ اپنی اور مالک کی تسلی کی خاطر اسے خریدنے والی آنکھوں سے دیکھا تو اس پر سو فیصد فرعون کی ممی ہونے کا گمان گزرا۔ ہمیں خیال ہوا کہ کہیں اس پر بیٹھتے ہی ہمارے سر میں بھی فرعونیت نہ سما جائے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں ہر بڑی سواری کو چھوٹی سواری نظر نہیں آتی۔

ہم نے موٹر سائیکل خریدی تو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ چاہا کہ اس موٹر سائیکل کو ابھی ابھی پَر لگ جائیں تا کہ جلد از جلد محلے داروں کو پتہ چل جائے کہ ہم کوئی پہلے والے پیدل یا سائیکل والے عام شخص نہیں ہیں بل کہ ہم دو پہیوں اور ایک انجن کی وجہ سے خاص ہو چکے ہیں اور ہماری شخصیت میں شان دار اور تیز رفتار تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ اب تو ہم زمین پر پاؤں بھی رکھیں گے تو زمین ہمارا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا کرے گی۔ جو لوگ ہمیں راہ چلتے روک روک کر ہمارا قیمتی وقت ضائع کیا کرتے تھے، انھیں ہم دور ہی سے ٹاٹا وغیرہ سے ٹرخا دیا کریں گے۔ بھلا یہ کوئی طریقہ ہے کہ بندہ ایک دوسرے سے گھنٹہ بھر یہی پوچھتا رہے ''ہور کی حال اے۔'' (اور کیا حال ہے؟) لاہور میں رہنے والوں کا حال تو ایک ہی ہوتا ہے، ''ہور'' حال کہاں سے لایا جائے؟ انسان مریخ تک پہنچ گیا، لیکن ہم لاہور کے پسماندہ لوگ ابھی تک ایک دوسرے کا ''ہور'' حال ہی دریافت کر رہے ہیں!

آج تک ہم یا تو ٹانگوں پر چلا کرتے تھے یا ٹانگوں کے زور سے سائیکل پر۔ اس لیے جب موٹر سائیکل پر سوار ہوئے تو ہمیں یوں محسوس ہوا، جیسے ہم کسی الف لیلوی کہانی کے مرکزی کردار ہیں اور قالین پر اُڑے جا رہے ہیں۔ ہمیں گیئر و یئر لگانے تو آتے نہیں تھے۔ پھر بھی دو ایک گیئر لگا کر ایکسیلیٹر دباتے رہے۔ ہماری رفتار کی یکسانیت سے یوں لگ رہا تھا، جیسے ہمیں چابی دے کر چھوڑ دیا گیا ہے یا پھر ہم ریموٹ سسٹم کی پابندی کر رہے ہیں۔ ہماری اس نو منسوب موٹر سائیکل کا سر بکری کی طرح تھا یعنی ہینڈل پر دو سینگ نمایاں تھے۔ ہینڈل کے نیچے ایک لمبی گردن چیسی سے جا ملتی تھی۔ اس گردن نے ایک پلاسٹک کور کے مفلر کا خواہ مخواہ احسان لے رکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہمارے ذہن میں خیال کی چنگاری سُلگی کہ اس کی ٹینکی کہاں ہے؟ ہم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ کیا خبر مالک پٹرول

پاپ کا مذاق کر رہا ہو۔ باہر کے ملکوں میں ایسی موٹر سائیکلیں بھی ایجاد ہو چکی ہیں، جو بغیر پٹرول کے چلتی ہیں۔ شاید یہ ان میں سے ایک ہو۔ بہر حال ایک جگہ ہم رکے۔ موٹر سائیکل کو سٹینڈ پر کھڑا کیا اور اس کے سارے جسم کو ٹٹو لنے لگے۔ ایک صاحب پاس سے گزرے۔ ان سے کہا کہ بھئی صاحب! اس موٹر سائیکل کی ٹینکی تلاش کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ انھوں نے گدی کو گدگدی کرتے ہوئے کنڈی کھولی۔ گدی یوں اوپر اٹھی، جیسے مگر مچھ نے منہ کھولا ہو۔ ہم پر کھلا کہ عام موٹر سائیکلوں کی ٹینکی گدی کے آگے ہوتی ہے، اس کی نیچے تھی۔ اس کی گدی اور فٹ ریسٹ کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا، اس لیے ہم اس پر بیٹھے ایسے لگ رہے تھے، جیسے جائے نماز پر دو زانو بیٹھے ''التحیات'' پڑھ رہے ہیں۔ گھر پہنچے تو سلام پھیر کر نیچے اترے۔ خوشی سے ہمارے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ ہمیں اور ہماری موٹر سائیکل کے دیدار کے لیے لوگ گلی محلے سے یوں نکل آئے، جیسے امریکی خلائی شٹل خلاء کا سفر کر کے بخیر و عافیت واپس آ گئی ہو۔ شام کے وقت ہم اس کی پریکٹس کرنے باہر نکل گئے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ اس کے انجن نے حشر اٹھا لیا۔ ہم سمجھ گئے کہ اسے اپنی تبدیلی مالک کا علم ہو گیا ہے اور یہ اپنے اصل مالک کے ہجر و فراق میں نالہ و شیون کر رہی ہے۔ ہم نے اسے روکنے کے لیے اپنے دل پر ہاتھ اور بریک پر پاؤں رکھا مگر وہ تھی کہ سامنے والے کھمبے سے ٹکرا کر سیدھی بلال گنج جانے پر تُل گئی تھی۔ اس گھبراہٹ میں ہم نے سوئچ آف کر دیا۔ پھر ہم اسے کان سے پکڑ کر ورکشاپ لے گئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ موصوفہ کے پیٹ کا دوزخ ہی سرد پڑ گیا ہے۔

ہماری موٹر سائیکل صبح جب سٹارٹ ہوتی تو یوں محسوس ہوتا، جیسے ٹریکٹر سٹارٹ ہو گیا ہے۔ ہمارے دو ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے تک ہمارے محلے کے لوگ آسانی

سے بتا سکتے تھے کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اسی طرح شام واپسی پر بھی دور سے پتا چل جاتا تھا کہ ہم آ رہے ہیں۔ گھر والوں کو یہ سہولت تھی کہ وہ موٹر سائیکل کی آواز سنتے ہی کھانا گرم کرنا شروع کر دیتے تھے۔

ہماری موٹر سائیکل کی شکل وصورت ایسی تھی کہ ہر کوئی اس کی خلاف توقع شکل دیکھ کر چونک پڑتا۔ رفتہ رفتہ اس کی قدر و منزلت بڑھتی چلی گئی۔ اسے جہاں کھڑی کرتے، اسے فوراً بچوں کا قُرب نصیب ہو جاتا۔ اتنی جلدی تو بچے کسی خوانچہ فروش کے گرد بھی جمع نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو اس کے چہرے پر بچوں جیسا بھولپن اور معصومیت پائی جاتی تھی۔ دوسرے بچوں جتنی پست قامت بھی تھی۔ میری واپسی پر وہ بے چاری کلچ کی تار اور بریک کے سپرنگ سے محروم ہوتی اور گھر پہنچ کر اچانک انکشاف ہوتا کہ اس کے انڈی کیٹر بھی غائب ہیں۔

ایک روز ہم صبح ہی صبح کوٹ پتلون پہن کر دفتر نکل گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ صبح صبح سڑکوں پر ٹریفک کم ہوتی ہے، اس لیے دھول بھی کم اُڑتی ہے۔ ابھی ہم گھر سے تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ کُتوں کا ایک متوسط خاندان ہماری طرف لپکا۔ ہم نے سوچا کہ کُتے پیدل ہیں اور ہم موٹر سائیکل پر۔ اوّل تو یہ ہمارے سوٹ بوٹ سے سمجھ جائیں گے کہ ہمارا تعلق کسی معزز گھرانے سے ہے، لہٰذا کوئی بداخلاقی یا بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ یہ صرف ہمارا خیال تھا، کُتوں نے اپنے دل میں کچھ اور ٹھان رکھی تھی۔ پہلے تو دادا بھونکے، پھر ان کا بیٹا اور آخر میں ان کا پوتا۔ ہم نے اپنے دل کو تسلی دی کہ یہ ہم پر نہیں بھونک رہے بلکہ اپنے ناشتے کے مینیو پر تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ جونہی وہ ہماری ٹانگ پر حملہ آور ہوئے، ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم نے موٹر سائیکل تیز کی لیکن دادا کُتے نے ایک ہی جست میں ہماری پتلون

کے پائنچے تک رسائی حاصل کر لی۔ ہم نے موٹر سائیکل مزید تیز کی تو کُتوں کی رفتار میں بھی تیزی آگئی۔ اب ہم نے اپنی ٹانگیں موٹر سائیکل کی گدی پر رکھ لیں اور ہماری خوش بختی کہ آگے سے کُتوں کا ایک اور خاندان آگیا۔ اس طرح ان کی توجہ ہماری طرف سے ہٹ گئی اور دو کُتے خاندان باہم دست وگریباں ہو گئے۔ ہمیں بہت افسوس ہوا کہ ہم نے کونسی موٹر سائیکل خرید لی ہے۔ موٹر سائیکل میں تو ہارس پاور ہوتی ہے، اس میں کُتے جتنی بھی پاور نہیں!

ایک روز ایسا ہی واقعہ پھر پیش آیا۔ ہم چوتھے گیئر میں بڑے مزے سے جا رہے تھے۔ ایک کُتا سڑک کراس کر رہا تھا۔ ہمارے موٹر سائیکل اور کُتے کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ اگر ہم ایمرجنسی بریک لگانے کے مرتکب ہوتے تو اُلٹ کر اسی کُتے کے منہ کے آگے گرتے۔ ہمیں یہ غصہ بھی تھا کہ یہ کُتا مخلوق سڑک کراس کرنے کے لیے زیبرا کراسنگ کے آداب سے بھی واقف نہیں، اس لیے انھیں سبق سکھایا جائے۔ ہم نے رفتار کم نہ کی اور موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ کُتے کی پسلیوں میں دے مارا۔ اس نے اپنی کمر کو خم دیا تو ہمارے ہینڈل کا توازن بگڑ گیا اور ہم وہیں گر کر کُتے سے بغل گیر ہو گئے۔

ہماری موٹر سائیکل کی شکل وصورت ایسی تھی کہ ہمارے دوست اس پر مختلف جملے چست کرتے، ایک دوست نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''اچھی تہمت لگوائی ہے۔'' ایک دوست نے جملہ کسا کہ کل شام جب میں نے آپ کو اس موٹر سائیکل پر دور سے آتے دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے آپ کُتے پر سوار ہو کر چلے آرہے ہیں۔

احباب ہمیں نئے نئے مشورے بھی دینے لگے۔ کوئی کہتا کہ ''صبح دفتر جاتے ہوئے اخبار بیچتے جایا کرو۔ کوئی کہتا کہ اکیلے اخبار سے کیا بنے گا، انڈے بھی ساتھ رکھ لیا کرو۔'' ہم نے سوچا تھا کہ موٹر سائیکل کا عوام الناس پر رعب پڑے گا۔ بلا شبہ اس کی آواز

اور دھوئیں کا تو لوگوں پر خوب رعب پڑ چکا تھا لیکن اس سے ہمارا اپنا رعب جاتا رہا تھا۔ اس کے ساز اور آواز سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا کہ اس سے دنیا ہی نہیں، عاقبت بھی سنور سکتی ہے، وہ اس طرح کہ رمضان المبارک کے دوران اسے گلی کوچوں اور محلوں میں چلا چلا کر سحری کے وقت شہر کے سوتے با آسانی جگائے جا سکتے ہیں۔

شروع شروع میں ہماری موٹر سائیکل فرماں برداری سے سٹارٹ ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے انجن سے شرم وحیا اُڑتی گئی اور یہ عین مجمع کے بیچ اڑیل ٹٹو کی طرح پیش رفت سے انکاری ہو جاتی۔ اب ہر کوئی ہمیں یہی نصیحت کرتا کہ جب تک یہ اپنے ٹائروں پر چل پھر سکتی ہے، اسے بیچ دو، ورنہ اس کے برابر صرف نمک ہی آئے گا۔ ہمارے علاقے میں موٹر سائیکلوں کی ایک نئی ورکشاپ کھلی تھی۔ ایک روز ہم اپنی موٹر سائیکل کو ہینڈل سے پکڑ کر ورکشاپ لے گئے۔ ہم نے ورکشاپ کے مالک سے کہا کہ ہم نے اپنی موٹر سائیکل کو بیچنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اور یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اس کے خریدار بھی آپ ہی ہوں گے۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی تو ہم نے پوچھا کہ موٹر سائیکل آپ کو پسند آگئی ہے کیا؟ کہنے لگا کہ ایسی ایک آدھ موٹر سائیکل ورکشاپ کے سامنے ضرور ہونی چاہیے تاکہ آتے جاتے لوگوں کو پتہ چلتا رہے کہ یہاں موٹر سائیکلیں مرمت کی جاتی ہیں۔ ورکشاپ کے مالک نے موٹر سائیکل کی تو کوئی قیمت نہ لگائی۔ البتہ ہماری عزت کی خاطر سات سو روپے دینے کا وعدہ کر لیا۔ ہم نے سات سو روپے دس روپے فی قسط کے حساب سے وقتاً فوقتاً تقریباً دو سال میں وصول کیے۔

❁❁❁

پنجابی فلمیں

پنجابی فلمیں دیکھنا خاصے دل گردے، لبلبے اور جگر کا کام ہے۔ پھر جگر بھی جگر مرادآبادی یا چیتے کا اور تجسس کم از کم مسرت شاہین کا ہونا چاہئے کیوں کہ ایک تو یہ فلمیں سردیوں میں برف خانوں اور گرمیوں میں دہکتے ہوئے ''تندوروں'' میں ایسے اینٹی دھاکوں کے ساتھ ریلیز ہوتی ہیں کہ سرکٹ کے تمام سینماؤں کے سر، ناک اور فلم بینوں کی جیبیں کٹ جاتی ہیں اور دوسرے، ان فلموں میں ہیرو اور ولن کے ڈائیلاگ وہ شورِ قیامت برپا کرتے ہیں کہ فلم بین کئی دن تک نہ صرف کوما اور ان ورنڈ کوما میں رہتے ہیں بلکہ وہ اپنی پسندیدہ بڑھکوں کی اُلٹیاں بھی کرتے رہتے ہیں۔ پنجابی فلم کا کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا جو کھڑکی توڑ اور کلائی مروڑ نہ ہو اور کوئی شو ایسا نہیں ہوتا، جو ہاؤس فل نہ ہو۔ اگر کسی فلم میں مردوں کو ''رن مرید'' دکھایا گیا ہو تو اسے عورتیں ایک بار نہیں بلکہ ہزار بار دیکھیں گی اور اگر عورت کو مرد کے پاؤں کی پانچ چھ نمبر کی سوئی یا ہوائی چپل دکھایا گیا ہو تو مرد حضرات اسے یوں پسند فرمائیں گے، جیسے بعض سیاست دان مارشل لاء کو۔ اگر فلم میں مردوں کی مونچھیں اور عورتوں کی ''مُکھیں'' اُترتی دکھائی گئی ہوں تو یہ فلم خواجہ سراؤں کی دنیا میں ہلچل اور چل چل مچا دے گی۔ کسی زمانے میں پنجابی فلموں میں گجراتی وزیر آبادی دھوتیوں کے ذریعے پنجابیوں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی کمزوریوں کو طشت از بام کیا جاتا تھا مگر اب یہ کمزوریاں

گھسی پٹی جین کی پتلونوں ہی میں زیرِ جامہ بن کر رہ جاتی ہیں کہ یہی مرضی فلمساز کی ہے۔ چند سال قبل پنجابی فلموں کا ہیرو لکھن کا پیڑا اور ایک پینٹل کا گلاس لسی پی کر جب اپنی میانی برانڈ ماں کے ناتواں کندھے جھنجھوڑتا ہوا کہتا تھا کہ ''ماں مینوں ایس لسی دی قسم اے۔ میں اپنے پیو تے تیرے سہاگ نوں اجاڑن والیاں دی نسلاں مکا دیاں گا!'' تو ہیرو کے منہ سے کم از کم ''چائی'' کی لسی کی بُو تو آتی تھی مگر آج کل کی فلموں میں ہیرو اپنی اوقات کی ڈیورنڈ لائن کراس کرتے ہوئے، جب اپنے دیسی جسم پر ولائتی لباس پھنسا کر، کاٹھے انگریز کا روپ دھارے، زبانِ غیر سے شرحِ آرزو کرتا ہے تو پنجابی تماش بینوں کی بہت سی آرزوؤں پر بجرا کابل پھر جاتا ہے۔ پنجابی فلموں کا فلم ساز ہیرو، ہیروئین، ولین اور اس کے چیچے کڑچھوں کو نئے نئے کپڑے پہنا کر خود عموماً پردۂ سکرین کے پیچھے عریاں ہی نکلتا ہے۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہی پنجابی فلموں کے کہانی نویسوں نے پنجابی فلموں کا ایک پائیدار سا مرکزی خیال بھی بنا لیا تھا تاکہ فلموں میں نئی نئی کہانیاں ڈال کر پنجابیوں کی خصلتوں کو نہ بگاڑا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی پنجابی فلم کا پہلا شارٹ دیکھ کر اس کے عبرت ناک انجام کا بخوبی پتا چل جاتا ہے۔ پھر ہماری پنجابی فلموں کی یہ خوبی بھی ہے کہ ان میں نئے چہرے متعارف نہیں کرائے جاتے بلکہ ہر نئی فلم میں پرانے چہروں کی ڈیٹنگ پینٹنگ کرا کے انھیں نئے چہرے ثابت کر دیا جاتا ہے۔

پنجابی فلموں میں ہیرو ہمیشہ مفلس و قلاش اور ولین امیرِ کبیر ہوتا ہے۔ ہیرو کا فطری میلان اگر تعلیم حاصل کر کے کچھ نہ کچھ کرنے کا ہو تو اسے زیور اور گھر کے برتن وغیرہ بیچ کر شہر بھیج دیا جاتا ہے اور اگر اس کا رجحان تعلیم اور کلچر کی بجائے ایگری کلچر کی طرف ہو تو وہ زر و زر کے بغیر ہی کسی کھال کی ''رٹ'' پر گاؤں کے چودھری پر آشنائی کا دعویٰ کر دیتا ہے۔

جب یہ چودھری اپنے چہرے پر خمیری روٹیاں لگوا کر اپنی حویلی میں پہنچتا ہے تو اس کی شیرنی جیسی بیٹی اپنے باپ کے بابرکت چہرے کو دیکھ کر اس قسم کا ڈائیلاگ بولتی ہے۔ ''ابا اک واری مینوں اوس مرد و دی شکل دکھا دے، میں اوس دے خاندان دے چہریاں نوں ایہہ جیا کر دیاں گی کہ اوہناں نوں کوئی کباڑیا دی قبول نہیں کرے گا'' اس کے بعد چودھری کی بیٹی اپنے باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے جب دھوتی بنیان میں ملبوس ہیرو کے پاس پہنچتی ہے تو وہ اسے تھپڑ رسید کرنے کے بہانے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیتی ہے۔ ہیرو جب اس کی وینی کو ایک ہی مروڑ دیتا ہے تو ہیروئین نہ صرف اسے دل اور کلیجی پھیپھڑا پیش کر دیتی ہے بلکہ وہ ''چھڈ میری وینی نہ مروڑ!'' گا کر فلم ساز سے لی ہوئی ایڈوانس رقم کو ناچ کر تھوڑا تھوڑا ہضم کرنا بھی شروع کر دیتی ہے۔

یہیں سے محبت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہیروئن کا دل محبت کے جذبات اور اس کا دیگچا دیسی گھی سے لبریز ہوتا ہے، اس لیے وہ ہیرو سے اظہارِ محبت کا خالص دیسی طریقہ اپناتی ہے۔ اب وہ اپنے سستے وقت میں سے قیمتی وقت نکال کر کسی نہ کسی بہانے ہیرو کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ ہیرو کے روزانہ کے معمولات اسے ازبر ہو جاتے ہیں۔ ہیرو کتنے بجے صبح نیند سے بیدار ہوتا ہے، کتنے بجے وہ حویلی پہنچتا ہے، کتنے بجے وہ کھیتوں کو پانی دینے نکلتا ہے اور کتنے بجے وہ بھینس نہلاتا ہے؟ ہیرو سے ملنے کے لیے وہ وقت کی بہت پابند ہوتی ہے، کبھی ایک آدھ منٹ لیٹ نہیں ہوتی اور ہمیشہ وہی پگڈنڈی اختیار کرتی ہے، جس پر ہیرو جا رہا ہوتا ہے۔

پنجابی فلموں میں فلم ساز اور ڈائریکٹر صرف ہیرو اور ہیروئن کی محبت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ محبت کو وسیع پیمانے پر دکھاتے ہیں۔ مثلاً دادی دادے کی محبت، تائی تائے کی

محبت، نائی اور نائن کی محبت، پھول کی پھول سے محبت اور جانوروں کی جانوروں سے محبت۔شروع شروع میں محبت پیدل ہوتی ہے۔ پھر یہ کسی نہ کسی سواری پر سوار ہو جاتی ہے۔ گاؤں میں کبھی گھوڑے پر، کبھی گدھے پر، کبھی بھینس اور کبھی ٹریکٹر پر بیٹھ کر محبت کی جاتی ہے جب کہ شہر میں محبت کبھی سائیکل پر، کبھی موٹر سائیکل پر اور کبھی کار پر بیٹھ کر کی جاتی ہے۔

ہیروئن جب ہیرو سے ملنے جاتی ہے تو وہ اپنی پیشہ ورانہ ڈیوٹی میں مصروف ہوتا ہے، یعنی وہ مولیوں اور گاجروں کے کھیت میں پانی اور کیچڑ میں لت پت ہوتا ہے۔ ہیروئن کھیت سے ایک گاجر اکھاڑ کر اسے کیچڑ والے پانی میں خوب صاف کر کے اپنے ریشمی لاچے کے ساتھ خشک کرتی ہے اور پھر اس گاجر کو گواہ بنا کر محبت بھرا مکالمہ بولتی ہے،''وے ساری دنیا دی گاجراں دی مٹھاس اک پاسے تے میرا مٹھا ماہی اک پاسے۔'' گاجر کا سر ہیرو کے دانتوں اور اس کی دُم ہیروئن کے دانتوں میں دکھائی جاتی ہے۔اسے ہیڈ اینڈ ٹیل رول کہتے ہیں۔ اگر گنے کا کھیت ہو تو گنا ہیرو چھیلتا ہے اور گنڈیری ہیروئن کھاتی ہے۔اس صورتِ حال کے پیشِ نظر سینما میں طبلے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہیروئن اپنے پاؤں دو تین بار زور زور سے کیچڑ میں مارنا شروع کر دیتی ہے۔ایسے لگتا ہے، جیسے اس کے پاؤں میں شیشہ وغیرہ لگ گیا ہے۔اس کے بعد ہیروئن اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔جس طرح وہ پیٹ ہلا کر رقص کرنے کی کوشش کرتی ہے، ایسے محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کے پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔ وقفے وقفے کے دوران وہ اپنے پورے جسم کو بھی حرکت میں لے آتی ہے۔اس حرکت میں کوئی برکت وغیرہ نہیں ہوتی بلکہ دیکھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ یہ حرکت مچھروں یا شہد کی مکھیوں کے اچانک حملے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہیروئن کے گلے میں ایک عدد دوپٹہ بھی موجود ہوتا ہے، جسے وہ بار بار دانتوں میں داب کر بار بار شرماتی ہے۔

جب پیٹ کی تکلیف شدت اختیار کر جاتی ہے تو وہ دوپٹہ اپنے پیٹ کے گرد کس کر باندھ لیتی ہے۔ کئی مرتبہ یہ دوپٹہ پٹے کی صورت میں ہیرو کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے، جس سے ہیرو "اپنا کیچڑ والا منہ" فوراً صاف کر لیتا ہے۔ جس طرح ہیروئن پاؤں اٹھا اٹھا کر کھیت میں رقص کرتی ہے، ان گنت گاجریں اور مولیاں خاکی لباس اتار کر برہنہ ہو جاتی ہیں۔ پنجابی ہیرو گانا سنتے ہوئے ایک طرف منہ کر کے گم سُم کھڑا ہوتا ہے، جس ہیرو پر کوئی بندوق، لاٹھی، دھوپ یا سردی گرمی اثر نہیں کرتی، اس پر گانا کیا اثر کرے گا؟ ہیروئن کبھی اس کے شانے جھنجھوڑتی ہے، کبھی اس کے سر کے بال اکھاڑتی ہے۔ ہیرو ہیروئن کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالتا، شاید اس نے اس سے دیسی گھی ادھار لیا ہوتا ہے۔ پنجابی فلموں میں ہیرو قطعاً رقص نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے سامنے ہیروئن کو نچواتا ہے۔ اس کا کام گانے کے دوران میں مزے مزے سے چہل قدمی کرنا ہے۔ ہیروئن کبھی ہیرو کے ٹخنوں کو چھوتی ہے۔ کبھی اس کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے۔ اگر ہیرو کو اس پر زیادہ پیار یا ترس آ جائے تو وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھا دیتا ہے یا ہیروئن کے سر پر اپنے بازوؤں کو ایک دو چکر لگوا کر اس کے ناچ کو زیادہ تیز کر دیتا ہے۔ گانا اگر باغ میں ہو رہا ہو تو وہ ہر درخت میں ٹانگ اڑاتی ہے اور اس کی ہر شاخ کو ہلا کر گزرتی ہے۔ کبھی کبھار وہ ہیرو کی ٹانگوں میں بھی اپنی ٹانگ اڑا کر اسے گرا دیتی ہے۔ بعض اوقات ہیرو ہیروئن سے چھپ کر باغ کی کسی دوسری روش پر الٹا چل نکلتا ہے لیکن ہیروئن کسی تیسری روش پر ہولے ہولے چل کر الٹے قدم چلتے ہوئے ہیرو کے پیچھے پہنچ جاتی ہے۔ اب ہیرو ہیروئن سے بے دھیانی سے ٹکرا کر کسی درخت کے تنے سے جا ٹکراتا ہے۔ ہیرو اس کی محبت اور درخت کی چوٹ خوب محسوس کرتا ہے لیکن ہیروئن اس کی چوٹ سہلانے کی بجائے اپنا بقیہ رقص مکمل کرتی ہے۔

جہاں تک پنجابی گانوں کا تعلق ہے تو ان گانوں کے اندر کوئی تہ در تہ معانی پوشیدہ نہیں ہوتے بلکہ فلمی شاعر کسی بھی موضوع پر گانا لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً ”جان کڈھ لئی آ بے ایمانا“ یعنی تم عزرائیل سے کم نہیں، اس لیے تم نے تو میری جان ہی نکال لی ہے۔ ”جدوں ہولی جئی لینا میرا ناں۔ میں تھاں مرجانی آں۔“ جب تم آہستہ سے میرا نام لیتے ہو تو میں مکمل طور پر مرجاتی ہوں۔ آیندہ تم مجھے بلند آواز سے پکارا کرو۔“

کسی زمانے میں لوگوں نے اس گانے کو بھی بہت پذیرائی بخشی تھی۔ ”شکر دوپہری پپلی دے تھلے۔ میں چھنکائیاں ونگاں“ اس کا اُردو ورشن تو یہ ہے کہ سخت دوپہر کے وقت میں نے پیپل کے درخت تلے اپنی چوڑیاں ہلا ہلا کر آواز پیدا کی۔ منچلوں نے ونگاں کی جگہ ٹنگاں کر دیا اور گانا ہتھیلیوں سے ہوتا ہوا ٹانگوں تک چلا آیا۔ ”تیرے آن دے کھڑاک بڑے ہون گے۔ مزے تے ماہیا ہن آن گے۔“ تم گھر آکر جب کھانسو گے تو خوب کھڑاک یعنی شور پیدا ہوگا۔ ”قمیض تیری کالی، سوہنے پھلاں والی“ یوں تو موسیقی روح کی غذا ہے لیکن یہ گانا سن کر احساس ہوتا ہے کہ موسیقی تن کی بھی غذا ہے اور ہیرو کپڑے کی دکان داری کرتے ہوئے اس کے ڈیزائن وغیرہ دکھا رہا ہے۔ ”ساری دنیا دو دو ہوگئی۔ میرا تن۔ اے کلا۔“ یہ گانا بھی ضرورتِ رشتہ کے تحت لکھا گیا ہے۔

پنجابی فلموں میں لڑائی اور مار کٹائی کے مناظر بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ جہاں تک فرنیچر کا تعلق ہے تو ایک چارپائی کو الٹا دیا جاتا ہے، ایک حقہ توڑ دیا جاتا ہے یا نان چنے، حلیم اور کھلونوں وغیرہ کی ریڑھیاں الٹا دی جاتی ہیں۔ گاؤں کی لڑائی میں صرف دو تین کھیتوں میں گھوڑے دوڑا دیے جاتے ہیں۔ ہیرو پر جب ولین اپنی ٹیم سمیت حملہ آور ہوتا ہے تو وہ عموماً خالی ہاتھ ہوتا ہے۔ ہیرو اور حملہ آوروں کے چہروں کے تاثرات سے یہ پتا

صاف چل جاتا ہے کہ دونوں ہرگز نہیں لڑنا چاہتے، صرف فلم کی کہانی انھیں مجبور کر رہی ہے۔ ولین اور اس کی ٹیم لاٹھیاں تھامے مرغوں کی طرح ہیرو کے گرد ایک چکر لگاتی ہے۔ وہ بیک وقت لاٹھیاں ہیرو کے سر پر دے مارتے ہیں لیکن ہیرو اپنے ہاتھوں پر تمام لاٹھیاں برداشت کر لیتا ہے اور ان میں سے اپنی پسند کی ایک لاٹھی نکال کر ولین اور اس کے ساتھیوں پر جوابی حملہ کرتا ہے۔ اب ولین کے ساتھی باری باری ہیرو سے لاٹھیاں کھاتے ہیں اور قریبی جوہڑ میں چھلانگیں لگاتے جاتے ہیں۔ ولین اگر چھری سے ہیرو پر حملہ آور ہو تو ہیرو فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے اور چھری اچانک راہ گیر ماشکی کی مشک میں گھس جاتی ہے۔ چھری کا دوسرا وار بھی خالی جاتا ہے اور وہ گزرتے ہوئے بیل کی ران میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہیرو ولین کی چھری والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اور وہی ہاتھ آہستہ آہستہ ولین کے پیٹ کی طرف جانا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں ہیرو اور ولین اپنے اپنے چہروں کو آخری حدوں تک بگاڑ لیتے ہیں۔ آخر ولین ہیرو کا کام آسان کرنے کے لیے اپنا پیٹ خود ہی چھری کے آگے کر دیتا ہے اور بڑی رغبت سے چھری اپنے پیٹ میں اتار لیتا ہے۔ ہیرو کے ہاتھ سے یہ پہلا قتل ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ جیل میں ہیروئن کے ہاتھ کی پکی ہوئی مکئی کی روٹی اور ساگ وغیرہ کھاتا ہے۔

ہماری پنجابی فلموں میں عموماً اس طرح ہیرو اور ہیروئن کے پہلے ہی گانے پر جب چودھری کی عزت کو چار بٹہ چھے لگ جاتا ہے تو بارہ آنے والے بڑھکیں مار مار کر وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کرتے ہیں کہ پردۂ سکرین کے پھٹنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اب ہیروئن اپنے باپ کے سفید خون پسینے کی کمائی سے ہیرو کو ''سُپر مین'' بنانا شروع کر دیتی ہے۔ آخر کوئی کیدو لنگا چودھری کی خواب میں آکر اسے ہیرو اور ہیروئن کی غٹرغوں غٹرغوں

کے بارے میں آگاہ کر دیتا ہے۔ چودھری تمام رات ''پسلیٹے'' مارتا ہوا ان تمام مکالماتِ افلاطونی کی مشق کرتا ہے، جو اس نے ہیرو کے روبرو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ چودھری سورج طلوع ہوتے ہی گاؤں کے تمام درزیوں کو لائن حاضر کر کے اپنے نمک خواروں کو مزید خوار کرنے کے لیے نئی دھوتیاں اور فلالین اور جاپانی فلیٹ کے کام دار کُرتے تیار کرنے کا آرڈر دیتا ہے۔ جب نئے کپڑے سِل کر تیار ہو جاتے ہیں تو چودھری ان کے ہم راہ غریب ہیرو کو کفن پہنا کر اس کے واغِ عیوب برہنگی ڈھاپنے چل نکلتا ہے۔

بعد ازاں اکیلا ہیرو چودھری اور اس کے درجنوں حواریوں کو طبلہ سمجھ کر وہ بجاتا ہے کہ ان کی نیکنی اور گیوا کلر دھوتیاں ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ ہیروئین ہیرو کے اس کاروبار پہ اس لیے خندہ زن ہوتی ہے کہ۔ ''کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا'' ...... جب ہیرو ہیروئین کے پاپا کو مزید دوا دینے کی کوشش کرتا ہے تو ہیروئین یو۔این۔او بن کر جنگ بندی کرا دیتی ہے۔

پروڈیوسر یا ڈائریکٹر جب دیکھتے ہیں کہ فلم وقت سے پہلے ہی ختم ہونے والی ہے تو وہ ہیروئن کی مصروفیت کچھ یوں بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً ہیرو کے دھوبی پٹڑوں سے جب ہیروئین کے ابا جان کی غیر معمولی غیرت کو ڈھل کر رابن نیل وغیرہ لگ جاتا ہے تو ہیرو اور ہیروئین کو گاؤں کے چپے چپے پر جمناسٹک کے کرتب دکھانے کا سنہری موقع مل جاتا ہے۔ ہیروئین اپنے مستقبل کے گھر کو جنت بنانے کی خاطر تمام اہم امورِ خانہ داری کی ریہرسل کرتی ہے۔ مثلاً کبھی ہیرو کے باجرے کی ''راکھی'' بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی ہیرو کو چوری کھلاتی ہے۔ کبھی اس کے کوٹھوں کی ''لپائی کرتی ہے۔ کبھی بھینسوں کی کچی دھاریں پیتی ہے اور کبھی کوندتی بجلیوں اور طوفانی بارشوں میں چڑے اور چڑیا کے رومانس سے ''انسپائر'' ہو کر ہیرو

کے غریب خانے پر سر کے بل چل کر جاتی ہے اور ''پہاں بھار'' واپس آتی ہے۔ اسی اثناء میں ڈائریکٹر ہیروئین کے ڈیڈی کی غیرت جگا کر سینما میں گہری نیند سوئے تماشائیوں کو بھی جگا دیتا ہے۔ اب ہیرو پر بھینسیں اور بکریاں چرانے کا الزام آتا ہے۔ پھر ہیرو کسی پرائمری سکول کی سلاخوں والی کھڑکی میں کھڑا ہو کر سزا کاٹتا ہے۔ عدالت میں جج صاحب ناک پر عینک اٹکائے، جب ہتھوڑا پکڑے خود ہی توہینِ عدالت کے مرتکب ہوتے، میز کی کیلیں ٹھونکتے نظر آتے ہیں تو ہیروئین اپنے باپ کے خلاف اتنی پائیدار گواہی دیتی ہے کہ ہیرو کو باعزت طور پر بَری کر دیا جاتا ہے۔ رہا ہوتے ہی ہیرو گانا گاتا ہے۔ گانا اگرچہ پنجابی ہوتا ہے مگر ہیرو کے جگالی کرتے ہونٹ کچھ اس طرح ہلتے نظر آتے ہیں، جیسے وہ تُرکی گانا گا رہا ہو۔ آخر میں کیمرہ سیکریسی برانچ یعنی ''مسہری'' کی طرف بڑھتا ہے، جہاں ہیرو اور ہیروئین اپنے اپنے عروسی لباسوں میں تماشائیوں کے اُٹھنے کا انتظار کرتے ہیں۔ اسی دوران میں تماشائی عرقِ ندامت سے شرابور چھوارے اور دھکے کھاتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔

❁❁❁

قوم کا درد یا کام کا درد

ہمارے ایک دوست ہیں، جو اکثر یہ کہتے ہیں کہ خدا غریب دشمن کو بھی ڈاکٹروں کے پاس نہ لے جائے۔ ہم نے انھیں ایک روز کہا کہ سب لوگ اگر صحت مند ہو جائیں تو ڈاکٹر حضرات آخر کیا کریں گے۔ وہ کہنے لگے کہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر کی کلینک اور پنکچر لگانے اور گوشت والی دکان میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ پرانے طبیب طب کے پیشے کو کمائی کا ذریعہ نہیں بناتے تھے۔ ان کے پاس کوئی غریب مریض آتا تو وہ نہ صرف تسلی سے اس کا علاج کرتے بلکہ کچھ پلے سے بھی دے دیا کرتے تھے۔ آج کل ڈاکٹروں کے پاس مریض کو چیک اَپ کرنے کے لیے وقت ہی نہیں رہا۔ ڈاکٹروں کے ہاں جتنا رش ہوتا ہے، انھیں اخبارات میں ضرورتِ فرصت کے اشتہارات چھپوانے چاہییں۔ میرے خیال میں ڈاکٹر حضرات مریض کو اتنا بھی چیک نہیں کرتے، جتنا پنکچر لگانے والا موٹر سائیکل یا سائیکل کی ٹیوب کو پانی والی تغاری میں کرتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ڈاکٹر مریض سے مرض کے بارے میں کم اور سیاست اور حالاتِ حاضرہ کے بارے میں زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں نصیب دشمناں ہمارے دوست کو آنکھیں دکھانے کے لیے ایک ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ آنکھوں کے موضوع پر شعراء کرام نے ہمیشہ طبع آزمائی کی ہے۔ شاعر جب کسی خوب صورت انسانی آنکھ کو تشبیہ دیتے ہیں تو ہمیشہ اسے کسی جانور کی یا پودے کی

آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مثلاً غزالی آنکھیں، نرگسی آنکھیں اور بادامی آنکھیں وغیرہ۔ ویسے مالی آنکھیں بھی اچھی تشبیہ ہے۔ ہمارے دوست اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان جو مکالمہ ہوا، وہ قارئین کرام کی خدمت میں حرف بحرف اور زیر زبر کے ساتھ پیش ہے۔

مریض: مجھے چند دن سے صاف نظر نہیں آ رہا۔

ڈاکٹر: آپ صاف چیزیں دیکھتے ہی نہیں ہوں گے۔

ڈاکٹر: (مریض سے آنکھیں چار کرتے ہوئے) آپ کی آنکھوں میں شرم وحیا کے علاوہ موتیا اتر رہا ہے۔

مریض: (مسکراتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب آپ شرم وحیا کی تشخیص بھی کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر: بھئی! یہ الفاظ تو میں نے از راہِ تفنن کہے ہیں۔

مریض: اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو آیندہ میرا نام لینے کی بڑی سہولت ہو گی، وہ مجھے ''موتیا والی سرکار'' کہا کریں گے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب! اگر بندے کی آنکھ میں موتیا اتر آئے تو اسے گلاب چہرے نظر آنے بند ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر: ملکی حالات کے پیشِ نظر گلاب چہروں کو تو آنکھیں ترستیاں ہیں۔ آج کل تو صرف زرد گلاب چہرے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔

مریض: ''مجھے کتنے دن آرام کرنا پڑے گا؟''

ڈاکٹر: (مسکراتے ہوئے) ہمارے ہاں مریض کو اپنے علاج کی فکر نہیں ہوتی، جتنی اسے آرام کی ہوتی ہے۔ قوم کا درد اب دلوں میں نہیں ہوتا

بلکہ کام کا درد پیٹ اور سر میں ہوتا ہے۔ لوگ ڈاکٹروں کی مٹھیاں، جیبیں اور پرس گرم کر کے اپنے اپنے محکموں سے چھٹیاں کرتے اور درخواستوں میں کوئی امید بر نہیں آتی، کوئی صورت نظر نہیں آتی، وغیرہ کے مضمون باندھتے ہیں۔

مریض: ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو مریضوں سے زیادہ محکموں سے ہمدردی ہے۔

ڈاکٹر: بھئی! ہمارے جھنڈے میں ہرا رنگ ضرور موجود ہے لیکن ہم نے ستر برسوں سے اپنی آنکھوں پر ہری پٹی باندھ رکھی ہے۔ کبھی ہماری آنکھوں میں جمہوریت اتر آئی، کبھی قوم کی بینائی تیز کرنے کے لیے سرمۂ مارشل لاء تیار کیا گیا اور کبھی قوم کی آنکھوں کو نگرانی کی عینک تجویز کی گئی۔

مریض: ڈاکٹر صاحب! جمہوریت، مارشل لاء اور نگرانی کے ادوار میں عام آدمی کی آنکھیں ہی کھلتی ہیں۔ آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو ایک اور ڈاکٹر کا ایک پیارا سا واقعہ سناؤں۔ یاد رہے کہ مریض کی سوچ مریضانہ اور ڈاکٹر کی ڈاکٹرانہ ہوتی ہے۔ ایک مریض نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ دوائی کے علاوہ میری بیماری کی وجوہات کے اسباب اور نتائج وغیرہ سمجھا دیں۔ یہ بھی بتا دیں کہ مجھے کن کن اشیاء سے پرہیز کرنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب ایک نظر اپنے مریضوں کی قطار دیکھی تو انھوں نے کہا کہ جن بیماریوں کے اسباب، نتائج اور علاج جاننے کے لیے میں نے اپنی زندگی کے قیمتی تقریباً اٹھارہ سو پچیس

دن، ساٹھ ماہ یعنی پانچ سال صرف کیے ہیں۔ آپ کو میں ایک منٹ میں کیسے سمجھا دوں۔

ڈاکٹر: ''بات کدھر سے کدھر نکل گئی۔ ویسے آپ آنکھوں سے اتنا ہی دیکھا کریں، جتنا ضروری ہے۔''

مریض: ''یعنی میں نظر کی لوڈ شیڈنگ یا بچت کیا کروں۔ ویسے یہ نظر بچت سکیم قومی بچت سکیم سے کافی ملتی جلتی ہے۔''

ڈاکٹر: ''پیارے مریض! آپ ذرا اپنے دن بھر کے کھانے کا شیڈول بتا دیں۔ آپ کی بیماری پکڑی جا سکتی ہے۔''

مریض: صبح ناشتہ کرنے کے بعد میں کام پر چلا جاتا ہوں۔ وہاں دس بجے سے لے کر بارہ بجے تک نظر کا ہی کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ کھانے سے قبل ہمیشہ سوچتا ہوں کہ آج کوئی ایسی چیز کھاؤں گا، جو صحت بخش ہو یعنی دن کو بھی تارے نظر آنے لگیں۔ جوں جوں کھانے کا وقت قریب آتا ہے۔ آنکھوں کے آگے صرف نان چنے یا نان حلیم ہی آتی ہے۔''

ڈاکٹر: ''ویسے جس طرح آپ نے نان چنوں اور نان حلیم کا ذکر کیا ہے، آپ کی آنکھوں میں موتیے کی بجائے حلیم یا چنے اترنے چاہییں تھے۔ نان ایک ایسا لفظ ہے، جو پیٹ میں پہنچ کر ہمیشہ بھگی بلی بن جاتا ہے اور ہمیشہ منفی اثرات پیدا کرتا ہے۔ ویسے جس طرح آپ سخت نان کھاتے ہوں گے، یقیناً ان کا لقمہ توڑنے کے لیے آپ کی انگلیاں

جواب دے جاتی ہوں گی اور آپ کسی سائیکل والی دکان سے پلاس منگوا کر نان کی کھال کھینچ کھینچ کر کھاتے ہوں گے۔

مریض: ''ڈاکٹر صاحب! آپ کی خدمت میں کتنی فیس پیش کروں۔''

ڈاکٹر: ''ایک ہزار روپے''

مریض: ''ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کی شکل صاف دکھائی دینے لگی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔''

سیر لنڈے بازار کی

لنڈے بازار سے ہمارے تعلقات اتنے ہی پائیدار اور دیرینہ ہیں، جتنے پاکستان اور امریکہ کے ہیں۔ ہم کبھی کبھار ان تعلقات کو فروغ دینے کے لیے لنڈے بازار کی سیر کو چلے جاتے ہیں۔ کہیں آپ یہ اندازہ نہ لگا لیں کہ لنڈا بازار ہی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ لنڈے بازار سے ہمارا تعارف تو سب سے پہلے ہمارے چچا جان نے کرایا تھا۔ دورانِ تعارف ہم غیرتِ قومی سے کچھ کچھ زمین میں بھی گڑ گئے۔ حالاں کہ ہمیں اکبرالہ آبادی کی طرح چند بے پردہ بیبیاں بھی نظر نہ آئیں۔ بس یوں محسوس ہوا جیسے ہم لہو کا لبادہ اوڑھ کر ''سرخرو'' ہو چکے ہیں۔ لنڈے بازار سے اصل تعارف تو اس روز ہوا جب ہمارا ایک دوست ہمیں بہلا پھسلا کر لنڈے بازار لے گیا۔ ہمیں جب اس کے منہ سے ماں باپ کے اطوار کی بجائے نیلے نیلے، اودے اودے اور پیلے پیلے پیرہنوں کی بُو آنے لگی تو ہمارے جی میں بھی آیا کہ چلو جب لنڈے بازار کی سیر کا سنہری موقع مل ہی رہا ہے تو بنیانوں یا جرابوں کا ایک آدھ جوڑا خرید نے میں کیا حرج ہے؟ پھر ہماری یہ سوچ ایک اور گہری سوچ سے برسرِ پیکار ہو گئی۔ وہ سوچ یہ تھی کہ کسی عزیز، رشتے دار یا محلے دار نے ہمیں کسی ریڑھی سے گوہرِ مقصود نکالتے دیکھ لیا تو میر کی طرح ہماری عزتِ سادات بھی جاتی رہے گی۔ پھر ہم نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ہم میر کی طرح کونسا عشق کر رہے ہیں، ہم تو صرف شاپنگ کر رہے

ہیں۔ ہمارا دوست چلتے چلتے ایک ریڑھی کے قریب مہنگائی کے ستائے ہوئے ان لوگوں میں کھڑا ہو گیا، جو نہ جانے کتنی دیر سے جرسیوں، کوٹوں اور جرابوں کا تیا پانچا کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے اِس کارِ خیر میں ہمیں بھی شامل کر لیا۔ ہماری نیت میں تو فتور تھا ہی، اس لیے ہم اپنے دوست کی بے کسی کی لاج اور لنڈے بازار کا منہ رکھنے کے لیے کبھی کبھار ریڑھی میں دونوں ہاتھ ڈال کر یوں اٹھا لیتے، جیسے قوالی کے دوران میں تالی بجانے والا شخص، یاد آنے پر اپنے دونوں ہاتھ ملا کر سامعین کے باپ دادا پر احسان کر ڈالتا ہے۔ ہمارا دوست کچھ ایسا ''شیم پروف'' ثابت ہوا کہ وہ بھرے بازار میں کوٹوں، جرسیوں، جرابوں اور بنیانوں کے اندر اور باہر داخل خارج ہونے لگا۔ ہم آئینے کی مانند حیران و ششدر، نہ صرف اس کی اُچھل کود دیکھ کر، اس کی سپورٹس مین سپرٹ کی داد دیتے رہے بلکہ اس کے انتخاب کے محاسن اور نقائص بھی بتاتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم روز مرّہ زندگی میں اپنے ہر عمل میں، اپنی روایات کو بھول بھال کر، انگریزوں کی طرح بڑے آدمی بننے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یعنی انگریزوں کو یہاں سے گئے ایک عرصہ ہو چکا ہے مگر آج ہم ان کی اُترن پہن کر کتنا اِتراتے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن لنڈے بازار کو ہم نے ہمیشہ میلی کچیلی نظروں سے ہی دیکھا ہے۔ انارکلی کا جب بھی کوئی ہمارے سامنے نام لیتا ہے، ہم اپنے دِلِ ستم زدہ کو تھام تھام لیتے ہیں مگر لنڈے بازار کا نام سنتے ہی ہمیں بے طرح غصہ آ جاتا ہے۔ حالاں کہ لنڈے بازار جانا یا اس میں سے گزرنا کوئی بُری بات نہیں کیوں کہ لنڈے بازار کو بیک وقت دو گراں قدر بازاروں یعنی لوہا مارکیٹ اور نولکھا بازار کی ہمسائیگی حاصل ہے۔ لنڈے بازار میں روزِ محشر کا سا سماں نظر آتا ہے۔ سردیوں میں لنڈے بازار کی ریڑھیوں کے اِردگرد کھڑے اَن گنت لوگ اپنی پسند کا سویٹر یا جرسی نکالنے کے لیے اپنی

اپنی ناپسندیدہ جرسیاں اور سویٹر ایک دوسرے کے آگے پھینکتے جاتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی جرسی یا سویٹر بہت سے ہاتھوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں فیصلے کے مُجملہ حقوق بحق ریڑھی بان محفوظ ہوتے ہیں۔ کوٹ بیچنے والوں کی سردیاں بڑے مزے سے گزرتی ہیں۔ بعض اوقات ان کے ناتواں کندھوں پر بھاری بھرکم انگریزوں کا بوجھ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ انھیں دو ایک کوٹ مفت دینے میں بھی تأمل نہیں ہوتا۔

ہمارے ہاں لوکل انڈرویئر بھی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ جس طرح بعض سنجیدہ مزاج دوست دو چار ملاقاتوں میں کھل جاتے ہیں، اسی طرح لوکل انڈرویئر بھی دو چار بار پہننے کے بعد نہ صرف کھل جاتے ہیں بلکہ خوب ''کھلے ڈُلے'' ہو جاتے ہیں۔ جب ایک ہی انڈرویئر بہت سے ہاتھوں کا شکار ہو جاتا ہے تو ایسے میں فیصلہ اسی کے حق میں ہوتا ہے، جس کے بارے میں کوئی بازاری شاعر فی الفور یہی کہہ سکتا ہے.....

جو بڑھ کر خود اُٹھالے زیرِ جامہ بس اسی کا ہے

لنڈے بازار میں پھیری لگانے والے رنگ برنگے کوٹ، پتلون، پاجامے، جرسیاں اور ٹائیاں اٹھائے راہ گیروں کا قافیہ یا ردیف وغیرہ تنگ کرتے ہیں۔ راہ گیر اگر یہ کہنے کی کوشش کرے..... بازار سے گزر رہا ہوں، خریدار نہیں ہوں۔ تو وہ کہتے ہیں کہ آپ ایک بار پہن کر تو دیکھیں۔ راہ گیر چپکے سے کھسکنے کی کوشش کرے تو پھیری والے اس کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں اور بالآخر اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کسی کافر ادا انگریز حسینہ کی فراک نما قمیص پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھیری والا کہتا ہے کہ ذرا بازوؤں کو ڈھیلا کرو اور گاہک بازو کے ایک جھٹکے سے اس کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ اب ایک پہنانے اور دوسرا نہ پہننے کا پختہ عزم کر لیتا ہے۔ یہیں سے کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے، جو عموماً کشتی

تک پہنچ جاتی ہے۔ بالآخر فراک کے بازو گاہک کے حصے میں اور اس کا بقیہ حصہ پھیری والے کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔

لنڈے بازار کے ریڑھی بان خواتین کی سستی نفسیات سے خوب واقف ہیں۔ وہ اپنی تمام ورائٹی کے الگ الگ دام پکارتے ہیں۔ پانچ کا لے جا، دس کا لے جا اور بارہ کا لے جا۔ ان آوازوں کے ساتھ وہ کپڑے ہوا میں اُچھال اُچھال کر ان کا انتساب بھی بچوں کے نام کرتے جاتے ہیں۔ پپو کا لے جا، منے کا لے جا، چُنے کا لے جا اور گُنے کا لے جا۔ تین چار خواتین جو گھر سے اجتماعی شاپنگ کرنے کے موڈ میں نکلتی ہیں، جونہی کسی ریڑھی کا گھیراؤ کرتی ہیں، ان کے ہاتھ برق رفتاری سے ریڑھی کے کپڑوں کو اوپر تلے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں اس وقت اولاد گھوم رہی ہوتی ہے۔ یہ قمیص فلاں کو پوری آجائے گی، یہ پاجامہ فلاں کی طبیعت کے لیے موزوں رہے گا۔ لنڈے کے بعض پیس اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ خواتین ان سے قطعاً کنارہ کش نہیں ہوتیں۔ وہ اس اُمید پر ایسے پیس خرید لیتی ہیں کہ چلو یہ کپڑے ''مُنے'' کو اس سال نہیں تو دو تین سال بعد کسی نہ کسی ''مُنے'' کو پورے آجائیں گے۔

لنڈے کے بعض کپڑے بہت دیدہ زیب ہوتے ہیں لیکن ان کی سلائی دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کیوں کہ ان کا آگا بھی کھل رہا ہوتا ہے اور پیچھا بھی۔ سب سے پہلے تو یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ مردانہ ورائٹی ہے یا زنانہ یا درمیانہ۔ اگر اس کی تخصیص ہو جائے تو بندے کو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ یہ کس موسم کا کپڑا ہے؟ شادی پر پہنا جاتا ہے یا تعزیت پر؟ اس کے اندر سر پہلے داخل کرنا ہے یا ٹانگیں۔ بعض اوقات کپڑے کا حدود اربعہ ہی سمجھ نہیں آتا۔

لنڈے کی ایک آئٹم ایسی ہے، جس کا تعلق پہننے سے نہیں بلکہ لٹکانے سے ہے۔ مسلمان ممالک کو ویسے بھی پردے کی اشد ضرورت ہے۔ جس طرح دن بدن کپڑا مہنگا ہوتا جا رہا ہے، کیا خبر ہفتے میں دو تین دن پردے ہی پہن کر گزارا کرنا پڑے اور تنخواہ دار قیس لنڈے کے پردے میں بھی عریاں ہی نکلیں۔ ہمارے ہاں بعض مرد بقول اکبر اپنی عقل بھی ڈھانپتے ہیں، اس لیے ان کے لیے یہی پردے مفید ہوں گے۔

انگریزوں کے ہاں تن کی عریانی سے بہتر کوئی لباس نہیں، جس طرح کم بولنے اور کم کھانے میں حکمت ہے، اس طرح ان کے ہاں کم پہننے میں بھی کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ ہمارے ہاں عوام الناس کو اپنی آمدنی کے محدود وسائل کے اندر کھانے اور تن ڈھانپنے کی فکر کھائے جاتی ہے لیکن انگریز بہادر جلد از جلد اپنے کپڑوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور زیادہ تر گلے اور سر ہی کو ڈھانپتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا پسندیدہ لباس چھتری، ٹائی اور ہیٹ ہے۔

''کپڑے'' گرتے ہیں تو بے چارے مسلمانوں پر

لنڈے بازار میں مناسب پیس خریدتے ہوئے خریدار بعض اوقات اپنے پہنے ہوئے کپڑوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ایک خاتون اپنی سفید پوشی کا بھرم سیاہ برقع سے قائم رکھے، لنڈے بازار گئیں۔ فٹ پاتھ پر لمبی ناک والا ایک سیل مین لمبی سی چھڑی کی نوک پر جرسیوں اور سویٹروں کو فضا میں بلند کر رہا تھا۔ سلائی، کڑھائی، دُھلائی اور مہنگائی جیسے قافیوں پر خواتین واہ واکرتی ہوئی بڑھ چڑھ کر جرسیوں کی نبضیں اور اپنے پرس ٹٹول رہی تھیں، سیل مین ''مفت ہی لے جا''، ''آج ہی لے جا'' اور ''سارے ہی لے جا'' کے نعرے لگا لگا کر خود ہی رقص کر رہا تھا۔ چیخ چیخ کر اس کی آواز بیٹھ چکی تھی اور اب صرف اس کا چہرہ

سرخ ہوتا تھا اور آخر میں "چاں" کی آواز نکلتی تھی، برقع پوش خاتون زمین پر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں محسوس ہوا، جیسے ان کے سر سے کوئی چیز کھسک رہی ہے۔ ایک نووارد بی بی عورتوں کی آڑ میں ان کا برقع اُتار کر سیل مین سے مخاطب ہوئیں۔ "اس کی جائز جائز قیمت لگانا۔"

ہمارے لباس

حضرتِ انسان جب گیہوں کی تندوری روٹی کے واسطے جنت سے نکل کر زمین پر ہنی مون منانے آیا تو دھوپ اس کا بین الاقوامی لباس دیکھ کر شرما گئی۔ حضرتِ انسان کے استقبال کے لیے جھنڈیاں لگوائی گئی تھیں اور چونا بھی چھڑکوایا گیا تھا۔ انسان نے جھنڈیوں اور چونے کی تو پروانہ کی مگر جب اس کی نظر کیلوں کے دروازے پر پڑی تو اس کی گریجوایٹ جس نے اسے ایک دم خبردار کیا کہ یہی وہ ''ستارالعیوب'' قسم کا پودا ہے جس کے پتوں پر مکمل تکیہ کر کے اپنے آپ کو کیموفلاج کیا جا سکتا ہے۔

غالب کو بدقسمتی سے آم پسند تھے اور اتنے پسند تھے کہ انھوں نے اس کی تعریف میں باقاعدہ مثنوی تصنیف کی ہے اور آج یہ عالم ہے کہ لنگڑے آم کی قیمت ہی سن کر آدمی لنگڑانے لگتا ہے۔ اگر چچا غالب کو کیلے کے پودے پسند ہوتے تو وہ اس قسم کا شعر کبھی نہ کہتے......

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

انسان نے کیلوں کے پتوں پر تکیہ تو کر لیا مگر جب یہی پتے ہوا دینے لگے تو اس نے سوچا کہ اسے اپنے جسم پر پوشش کروانی چاہیے تاکہ سردی اور گرمی اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش ہی نہ کرے۔ چناں چہ اسے ایک معزول شیر کو درخت پر چڑھنے کا گر

سکھانے کی ٹیوشن مل گئی۔ جب معزول شیر کو کچھ کچھ درخت پر چڑھنا آ گیا تو اس نے بڑی ترنگ میں آ کر انسان سے کہا کہ ''بول مٹی کے باوے کیا مانگتا ہے؟'' انسان نے کہا۔ ''مجھے تیری کھال چاہئے'' یہی وہ دور تھا، جب شیروانی کی بنیاد رکھی گئی۔ شیروانی اگرچہ ہمارا قومی لباس ہے مگر قوم نے اسے ابھی اپنے اعصاب پر کلیتاً سوار نہیں کیا۔ شیروانی کے نام سے تو یوں لگتا ہے، جیسے اس کی پبلسٹی میں نوشیرواں اور شیر شاہ سوری کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ ہمارے ہاں شیروانی شاید اس لیے بھی کم پہنی جاتی ہے کہ ایک تنخواہ دار شخص اگر کسی مہینے اسے سلانے کی جرأت کر لے تو اس کے گھر کا تمام بجٹ ہمارا قومی بجٹ بن جاتا ہے۔ پھر بھی شیروانی وہی لوگ پہنتے ہیں، جن کا قد اور تقویٰ کم از کم سرو جتنا ہو اور ان کے نزدیک وقت کی اتنی قدر نہ ہو، جتنی کہ ویگن اور رکشہ ڈرائیوروں کو ہوتی ہے۔ غالب نے شیروانی کے بٹن بند کرنے کے کیمیائی عمل کو اس مصرعے میں کیا خوب باندھا ہے۔

''تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے''

بس ہمیں ہاکی کے میدان میں تھوڑا سا خسارہ ہوا کہ وہاں ہمیں نیکر اور بنیان والا سلیم شیروانی دستیاب ہوا مگر اس نوجوان مسلم کا تدبر دیکھئے کہ اس نے شیروانی کی طوالت اور شرافت کا بھرم رکھتے ہوئے اپنے مختصر لباس میں جامع رزلٹ دیا۔

پرانے شاعر شیروانی ہی پہنتے تھے۔ بادشاہ بھی شاعروں کو انعام کے طور پر شیروانی ہی عطا کیا کرتے تھے تاکہ شاعر کچھ پہننے کے لیے روز روز نہ مانگا کریں۔ عورت پردہ اور فضول خرچی کرے تو برقعہ بنتا ہے لیکن پہننے میں مرد فضول خرچی کرے تو شیروانی بن جاتی ہے۔ یہ جتنی لمبی ہوتی ہے، اتنی ہی اس کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ ہمارے سیاست دان شیروانی بہت شوق سے پہنتے ہیں کیوں کہ وہ زندگی میں کئی بار وزارت کا حلف اٹھاتے ہیں اور کئی بار

جیل کا...... یعنی حلف اٹھانے کے لیے پہن لی اور جیل جا کر بچھالی۔ اسے پہن کر بندے کی شخصیت مکمل ہو جاتی ہے اور وہ دوسروں میں معزز سا نظر آتا ہے۔ کپڑے جسم ڈھانپتے ہیں۔ یہ کپڑوں کو ڈھانپتی ہے۔ اس کے اوپر کچھ نہیں پہنا جاتا، اگر اس کے نیچے بھی کچھ نہ پہنا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر بندہ شیروانی سے اُکتا جائے تو اسے ضرورت مندوں میں برابر تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہم دیہات میں جائیں تو ہمیں ایک ایسا لباس ہر ایک کی کمر کے گرد لپٹا نظر آئے گا، جسے اہلِ نظر تہمد کہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر ذہن فوراً رتن ناتھ سرشار کے ناول "فسانۂ آزاد" کے ڈھیلے پلاٹ کی طرف جاتا ہے۔ اگر کوئی پڑھا لکھا دیہاتی تہمد باندھ لے تو ابوالکلام آزاد کا چھوٹا بھائی دکھائی دیتا ہے اور اگر کوئی صرف محمد حسین نامی آدمی تہمد کا اہتمام کرے تو وہ محمد حسین آزاد لگتا ہے۔ سرشار نے تو "فسانۂ آزاد" قلم برداشتہ لکھا تھا اور دیہاتی شاہد تہمد دل برداشتہ ہو کر پہنتے ہیں۔ دیہاتی بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر اس لیے بھی تہمد میں گم ہو جاتے ہیں کہ نہ کوئی دیہاتی رہے باقی اور نہ کوئی شہری۔

تہمد کی طرح دھوتی بھی پنجابیوں کی ایک ہلکی سی کمزوری ہے۔ یہ اس قدر کثیر المقاصد اور کثیر المناظر ہے کہ ساغرِ جمشید بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ دھوتی ایک ایسا لباس ہے، جسے پہن کر بھی بندہ بے لباس ہی نظر آتا ہے۔ دھوتی ہینگر میں لٹکی ہو یا بندے کی کمر پر، کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دھوتی پہن کر بندہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس نے کچھ پہنا بھی ہے یا نہیں۔ پنجابی اسے نیند اور بیداری دونوں حالتوں میں پہنتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ شب خوابی کے لیے اس سے بہتر روئے زمین پر کوئی لباس ہی نہیں۔ البتہ رات کو پہن کر سوئیں تو صبح تک یہ اپنے اصل مقام سے ہٹ جاتی ہے اور کہیں غائب ہو چکی ہوتی ہے، اس لیے صبح

اسے خود بستر کے کسی کونے کھدرے سے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسے بار بار دھونا نہیں پڑتا کیوں کہ اس کا نام ہی دھوتی ہے بلکہ یہ ''نہاتی دھوتی'' ہے۔

دھوتی کا کوئی حریف لباس ابھی تک بازار میں نہیں آیا۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا نام ''میلی'' ہوگا۔ یہ اتنی ہلکی ہوتی ہے کہ پھلکی بھی کیا چیز ہے...... کسی انگریز کو کسی پنجابی کے گھر ٹھہرنا پڑا۔ رات کو انگریز نے پنجابی سے سلیپنگ سوٹ کا مطالبہ کیا تو پنجابی نے جھٹ اپنے والد صاحب کی آوٹ آف ڈیٹ دھوتی انگریز کی خدمت میں پیش کر دی۔ انگریز نے اسے پتلون کی طرح پہننے کی کوشش کی تو وہ کپڑے کے تھان کی طرح کھلتی چلی گئی۔ انگریز نے پنجابی سے کہا کہ ''تم غلطی سے فالتو کپڑا اٹھا لائے ہو۔ اسے الماری میں رکھو''۔

صوبہ سرحد میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ گھیرے دار شلوار پٹھانوں کا پسندیدہ لباس ہے۔ پٹھانوں کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا شلواروں ہی میں گزرتا ہے۔ پٹھان دائرۂ شلوار میں داخل ہونے کے لیے میٹروں یا گزوں کے چکر میں نہیں پڑتے بلکہ وہ تھان ہی خرید لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شلوار میں انسان کا جسم خوب پھلتا پھولتا ہے اور سخت گرمیوں میں یہی شلوار ایئر کنڈیشنر میں بدل جاتی ہے۔ پتلون پٹھانوں کے نزدیک نہایت ہی نچلے درجے کی چیز ہے کیوں کہ اس میں بے پردگی کے بہت معقول انتظامات موجود ہیں، پیٹ میں اپھارے کا باعث بھی بنتی ہے اور یہ انسانی صحت کا بھرم بھی قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس کے علاوہ اسے پہن لیا جائے تو وفادار و بے وفا کتے پٹھانوں کا راستہ روک روک کر ان کا شناختی کارڈ چیک کرتے ہیں۔ پٹھانوں کی غیرت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ پتلون پہن کر جہاں جہاں سے گزریں، لوگوں کی جلالی و جمالی آنکھیں انھیں انگریزوں کی غلامی کا طعنہ دیں۔ انھیں تو اس پتلون سے موت اچھی لگتی ہے کہ جس کی بدولت ان کی شلوار

اور نسوار میں کوتاہی آئے۔

پاکستان جب سے معرضِ وجود میں آیا ہے، دو چیزیں وافر مقدار میں بدلی ہیں۔ حکومتیں اور فیشن۔ کسی زمانے میں تنگ لباس نے پوری قوم کو ہی تنگ کر کے رکھ دیا تھا۔ خاص کر عورتیں جب تنگ لباس میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھیں تو ان کی تن درستی ان کی تنگ دستی کی چغلی کھاتی تھی اور وہ ایک انجانے خوف سے گر جانے والی چیزیں بھی بڑی فیاضی سے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتیں۔

مرد حضرات بھی جب ٹچ بٹنوں والی پتلونیں پہن کر چلتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ بیساکھیوں کے سہارے چل رہے ہیں۔ تنگ لباس میں پورے جسم کی ہم درد صرف آنکھ ہی ہوتی تھی کیوں کہ مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی تھی آنکھ۔ تنگ پتلونیں جلد یا بدیر پہن تو لی جاتی تھیں مگر انھیں اتارتے وقت کمیٹی والوں کی خدمات مستعار لینا پڑتی تھیں۔ قوم جب تنگ فیشن سے واقعی تنگ آ گئی تو اس نے درزیوں کی سلائیوں کو ذوقِ یقین سے ادھیڑ کر ''بیل باٹم'' کا فیشن عام کر دیا۔ ٹیڈی فیشن کیا تھا۔ سلائیوں میں ظہورِ ترتیب اور بیل باٹم انھی سلائیوں کا پریشاں ہونا...... بیل باٹم ایک ایسی پتلون تھی، جو پتلون کم اور ڈگڈگی کا غلاف زیادہ لگتی تھی۔

ہمارے ہاں ایک اور لباس ہے، جو بڑی شد و مد سے پہنا جاتا ہے۔ وہ ہے ''جین''۔ جین کے اندر نوجوانوں کی جان ہے۔ اس لیے نوجوان جین پہن کر ہی اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں۔ جین کی اکلوتی پتلون دیگر پتلونوں کو یوں کھا جاتی ہے، جیسے گناہ نیکیوں کو یا صدقہ بلا کو۔ جین ایک تو طلبہ کی غربت اور جوانی کا لحاظ بہت کرتی ہے، دوسرے، یہ انھیں اپنے شکنجے میں اچھی طرح کس بھی لیتی ہے۔ یہ نظر بٹو کے طور پر بھی کام آتی ہے اور

سب سے بڑھ کر دھوبی اور درزی زندگی سے یوں نکل جاتے ہیں، جیسے داڑھی رکھ لینے کے بعد نائی اور شیو کا سامان۔ ہماری طلبہ برادری اسی جین کے سہارے کھڑی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہم ان کی پتلونوں پر لات مارتے لیکن طلبہ کی لاتوں پر جین کی لاتیں بری طرح مسلط ہیں۔ بغیر کسی تعصب کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جیسے اینٹ کا جواب پتھر ہے، اسی طرح ہمارے ہاں کے گرد وغبار کا جواب صرف جین ہے..... اس کے علاوہ جین پہن کر بیٹھیے، کھڑے ہو جایئے، لیٹیے، حتیٰ کہ لونگیاں لگایئے، کیا مجال کہ اس کی کریز میں ایک لکیر کا بھی اضافہ ہو۔

جین دن کا چین اور رات کی نیند بھی حرام کر دیتی ہے کیوں کہ جین شناس جوشِ جنوں میں کسی ریڑھی والے سے پتلون تو خرید لیتے ہیں لیکن اس کے نتائج خارش کی صورت میں نکلتے ہیں۔ جس جین کو تسکین کا پھاہا سمجھ کر خریدا گیا، وہی تکلیف کا باعث بن گئی۔ انسانی اعضاء کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہئے نہ کہ ایسی پتلونوں کے ذریعے انھیں امتحان میں ڈالا جائے۔ جین ایک بین الاقوامی لباس ہے اور اپنے بارے میں خود کہتی ہے۔

انتہا فیشنوں کی بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

سونا بھٹی میں کُندن بنتا ہے، حنا پتھر پہ پس کر رنگ لاتی ہے، اسی طرح جین لنڈے بازار کی گانٹھوں سے نکل کر فرش پر رگڑی جاتی ہے۔ عام طور پر جس کپڑے کا رنگ اُڑ جائے، اس کی آب جاتی رہتی ہے اور لوگ اس کے پہننے سے کتراتے ہیں لیکن جین کو یہ شرف حاصل ہے..... رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

رضائی

''رضائی'' پر میرا مضمون پڑھ کر شاید آپ یہ سوچیں کہ جب ادبی بیڈ پر پہلے ہی سے ایک ''لحاف'' موجود تھا تو رضائی کی کیا ضرورت تھی تو جناب پہلی بات دراصل یہ ہے کہ کسی دوسرے کا وجود تسلیم کرنا ذرا مشکل ہے اور دوسری یہ کہ بندہ جب اپنی زندگی میں کسی کو شریک ہی نہ کرنا چاہے تو اسے پھر ایک کی بجائے دو ''لحافوں'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملیریے کا مریض دو رضائیوں میں بھی کانپ رہا ہوتا ہے۔ عصمت چغتائی نے جتنی محنت اور کاوش سے ''لحاف'' لکھا ہوگا، اس سے بہت کم محنت پر وہ پانچ دس ''رضائیاں'' تیار کر سکتی تھیں۔ سردیوں میں بندہ باہر سے جونہی ٹھٹھرا ہوا آئے، وہ فوراً لحاف ہی میں گھستا ہے۔ بندہ اگر دن بھر بیکری کی چیزیں، پھل فروٹ اور دیگر الم غلم کھاتا پھرے لیکن گندم کی روٹی کے بغیر اسے تسلی نہیں ہوتی۔ اسی طرح آپ سردیوں میں لنڈے بازار اور انارکلی کے کوٹ، جیکٹیں، دُھسّے اور کمبل وغیرہ کیوں نہ خرید لیں، جب تک آپ رضائی نہیں لیں گے، آپ کی سردی دور ہو ہی نہیں سکتی۔ عصمت چغتائی اور منٹو نے ادب کی خدمت کے ساتھ سردیوں کی بھی بہت خدمت کی ہے۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں سردیوں کا ادب کرنا چاہئے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سردیوں میں سینہ تان کر اور قمیص کے بٹن کھول کر گھر سے نہیں نکلنا چاہئے حالاں کہ سردی بڑے بڑے اکڑ کر چلنے والوں کو عاجزی سے چلنا

سکھا دیتی ہے۔ ہمارے نقاد سیف اللہ خالد کہتے ہیں کہ سردیوں کا نہ صرف ادب کرنا چاہئے بلکہ رضائی کے اندر گھس کر ادب پڑھنا بھی چاہئے۔ اعلیٰ ادب تو جیلوں میں تخلیق ہوا ہے اور گرم ادب لحافوں اور رضائیوں ہی میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ اسی طرح آگ لگانے والی شاعری اور تنقید بھی رضائیوں ہی کی پیداوار ہے۔ ہمارا ایک دوست، جو عصمت چغتائی کے ''لحاف'' کا بہت مداح ہے۔ اکثر کہتا ہے کہ عصمت نے بہت سی باتیں روئی میں لپیٹ کر بیان کی ہیں حالاں کہ اس سے بھی آگے کی باتیں ہمارے بہت سے پروفیشنل واعظ یوسف زلیخا کی آڑ میں کھول کھول کر اور مزے مزے سے بیان کر جاتے ہیں۔ بعض لوگ چھوٹی موٹی رضائی میں گزارا کر لیتے ہیں لیکن بعض کا تو نمرود کی رضائی میں بھی بھلا نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں مرد اور عورت ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں میں ہوا کی مقدار برابر ہو تو گاڑی چلتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے گھروں میں گوبھی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ گھریلو کام کاج کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو یوں لگتا ہے کہ کام تو عورت کرتی ہے، مرد تو صرف کاج بردوزِ راج ہی کرتا ہے۔ عورت بیچلر مرغ کی اذان پر کلمہ پڑھتی بیدار ہو جاتی ہے۔ برتن مانجھتی ہے اور کنالی میں آٹا گوندھتی ہے۔ آٹا گوندھتے ہوئے عورت کو جتنا وجد آتا ہے، اتنا وجد تو عزیز میاں مرد پر اپنی قوالی کے زریعے بھی طاری نہیں کر سکتے تھے۔ مرد کہیں آٹا گوندھنے پر آجائے تو پاؤں سے گوندھتا ہے۔ اسی طرح عورت کے اعصاب پر چارپائیوں کا نظام بھی سوار ہے۔ مرد چارپائیوں کو لنگر انداز کرتا اور بچھاتا اپنی توہین سمجھتا ہے اور چارپائی پر بچھ جانا اپنا پیدائشی حق۔ رضائی کو لیجئے، مرد صرف اس میں بے خطر کود نا ہی پسند کرتا ہے۔

سردیوں کے آغاز ہی میں روئی دھننے والی مشینیں احساسِ سردی کو کچلنے کے لیے

متحرک ہو جاتی ہیں۔ عورتیں رضائی کا پیٹ چاک کر کے اندر سے ''ز'' اور ''ی'' کے مہینوں میں پامال شدہ روئی برآمد کرتی ہیں۔ پھر یہ روئی شکنجے میں آ کر اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتتی ہے۔ بعد ازاں عورتیں اس صالح روئی کو دو عالم چنا سائز چادروں میں رکھ کر لذتِ بخیہ گری سے آشنا کرتی ہیں۔

رضائی اپنی سالانہ زندگی کے آٹھ ماہ پیٹیوں میں فینائل کی گولیوں کے ہم راہ ''ناک مچولی'' اور بقیہ چار ماہ انسانی جسم سے کھیلتی ہے۔

کہانی سننے سنانے اور ہنکارا بھرنے کا جتنا لطف رضائی میں آتا ہے، اتنا لطف تو سوتے وقت سوہن حلوہ کھانے کا بھی نہیں آتا۔

چڑے اور چڑیا، طوطا مینا، داستانِ امیر حمزہ اور عمرو عیار کی عیاریاں جیسی کہانیاں رضائی کی گرمی ہی کی بدولت داستانوی ادب کا حصہ بنیں۔ رضائی ہی وہ مظلوم آلہ ہے، جس میں گھستے ہی سب سے پہلے ہر شخص اپنے گرد آلود پاؤں صاف کرتا ہے کیوں کہ غسل خانوں میں جھانویں سے پاؤں وہی رگڑتا ہے، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہی نہ ہونا چاہتا ہو۔ رضائی کا رواں رواں اس بات کا گواہ ہے کہ اس میں خدا کی مرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس لیے تو یہ بچوں اور بوڑھوں کو یکساں مرغوب ہے۔ بوڑھے ایک مرتبہ رضائی میں گھس جائیں تو پھر وہ رضائے الٰہی سے ہی باہر آتے ہیں۔ بچے رضائی دیکھتے ہی تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زرقا فلم کے اس گانے ''رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے!''۔ کو اپنی ایڑھیوں، پنڈلیوں اور کولہوں میں بڑے فن کارانہ انداز میں ڈھال لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے پاتھی گراؤنڈ سمجھ کر اس پر ایسے ایسے کھیل کھیلتے ہیں، جن کا ہماری تہذیب و تمدن سے کوئی تعلق نہیں۔ پروین شاکر کو تو اپنے عہد کے بچوں سے صرف یہ

شکایت تھی کہ وہ دن کے وقت جگنو کو پرکھنے کی ضد کرتے ہیں، جب کہ ہمیں اپنے عہد کے بچوں سے فقط یہ شکوہ ہے کہ وہ دن کے وقت بھی رضائی کو رضا کارانہ طور پر بے آرام رکھتے ہیں۔

رضائی اوڑھتے ہی آدمی پندرہ بیس منٹ تک جب لات زنی کرتا ہے تو ایسے لگتا ہے، جیسے اس کے آبالاتی ومناتی ہوں۔ رضائی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ معزز سے معزز شخص کو بھی پیچ وتابِ رازی کھانے پر مجبور کردیتی ہے۔ آدمی رضائی کے اندر نہ صرف یوگا اور جوڈو کراٹے کی ورزشیں کرتا ہے بلکہ وہ جسمانی اعضاء کے ذریعے ایسے ایسے ہندسے بھی بناتا ہے کہ نئی نسل کے لیے ریاضی کا ایک اچھا خاصا قاعدہ ایجاد ہوسکتا ہے۔

یوں تو رضائیوں کی بے پناہ قسمیں ہیں مگر ایک قسم مجھے آج تک یاد ہے۔ مجھے ایک بار کسی دوست کے ہاں شبِ غم گزارنے کا غم گین اور حسین اتفاق ہوا۔ دوست نے اپنا اکلوتا بستر دوستی کی خاطر داؤ پر لگا دیا۔ پھر وہ ایک عدد ٹی کوزی نما رضائی لے آیا۔ یہ رضائی دیکھ کر میری روح کانپ اٹھی۔ میرے جی میں آیا کہ اس رضائی پر ایسی تنقید کروں کہ ہماری دوستی دشمنی میں بدل جائے۔ پھر میں اپنے تنقیدی شعور کو سمجھا بجھا کر لیٹ گیا۔ میں نے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جسمانی اعضاء کا ایک مجموعہ مرتب کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کا پاؤں کے ساتھ مصافحہ کرایا۔ سر اور گھٹنوں کا معانقہ کرایا۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے جسم کے بالائی اور زیریں علاقوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوچکے ہیں اور میرے جسم کے تمام کل پرزے ایک دوسرے کی پالیسیوں سے متفق ہیں تو مجھے اپنے اوپر ٹی ہاؤس کے کسی انٹلکچوئل کا گمان گزرا۔ میں نے ٹی کوزی نما رضائی اوڑھی اور انتقاماً دلی دکنی دور کے خراٹے لے لے کر اپنے دوست کی نیند میں پیوند لگانے لگا۔

رضائی ایک ایسا گوشۂ عافیت ہے کہ اس میں بیٹھتے ہی آدمی کا جی چاہتا ہے کہ وہ حوالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرے۔ اپنی سوانح عمری اپنے سوکھے بچوں کے کمزور حافظوں میں ریکارڈ کرائے۔ اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو دور کرنے کے لیے ان کے عیب بڑے لطیف پیرائے میں گنوائے۔ اپنے ہمسائے کے بچوں کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر شبنم افشانی کرے۔ حقہ پیے، مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھائے۔

رضائی میں داخل ہوتے ہی آدمی اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جاتا ہے۔ ویسے رضائی موت کے خوف سے نجات دلانے کا ایک ذریعہ بھی ہے کیوں کہ اسے اوڑھتے ہی پہلا خیال نکیرین ہی کا آتا ہے۔ نکیرین سے یہاں مراد ہاکی کے کھلاڑی نہیں بلکہ وہ فرشتے ہیں، جو قبر میں ہا کیوں کی بجائے گُرزیں لے کر آتے ہیں۔ رضائی کے محاسن پر شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی اظہارِ خیال کر چکے ہیں.....

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس شعر میں علامہ صاحب نے رضائی کی تھوڑی سی روئی (جو انگریزی E کی آواز بھی دیتی ہے) شعر کا وزن پورا کرنے کے لیے نکالی ہے۔ یہاں خودی سے مراد اپنے آپ کی پہچان ہے۔ ظاہر ہے ایک زاہد اینڈ زاہد آدمی سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں اپنی رضائی کی پروا کیے بغیر جب خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے تو خدا اُس سے پوچھتا ہے۔

اے زاہد! بتا تیری رضائی کہاں ہے؟

رضائی کا ایک ڈارک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں گھسنا آسان ہے اور نکلنا مشکل۔ کیوں کہ رضائی میں پنجابی میں سونے کا لطف اور مزا ہی کچھ اور ہے۔ ویسے بھی

رضائی کی روئی جب بندے کو سوئی کے مقام پر پہنچا دیتی ہے تو پھر وہ قدرت کے بلاوے پر بھی رضائی نہیں چھوڑتا۔

جہاں تک رضائیوں کے نمونوں اور رنگوں کا تعلق ہے۔ یہ آج بھی بہادر شاہ ظفر کے رنگون بھیجے جانے پر کفِ افسوس مل رہے ہیں۔

رضائی کی روزمرہ پاک دامنی کے لیے نہ تو پٹرول سے کام لیا جاتا ہے اور نہ ہی پانی سے۔ بلکہ اسے جلتے سورج تلے ہمسائے کی دیوار کو پہنا دیا جاتا ہے تاکہ اسی بہانے رضائی مخلوق کو بھی اپنے ہمسائے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کا موقع مل سکے۔

سرکاری اور غیر سرکاری نلکے

سرکاری نلکوں کو دیکھ کر ہمیں غیر سرکاری نلکے بے طرح یاد آنے لگتے ہیں حالاں کہ غیر سرکاری نلکوں سے پانی حاصل کرنا چکی کی مشقت سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ کیوں کہ غیر سرکاری نلکوں کو ''گیڑ'' کر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات غیر سرکاری نلکوں کا پانی اتر بھی جاتا ہے۔ اس وقت کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے، جو سائیکل کے کُتّے فیل ہو جانے کے موقع پر ہوتی ہے۔ بہرحال سائیکل کے کُتوں کو ورکنگ آرڈر میں لانے کے لیے کسی کُتّے ہی کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں، جب کہ غیر سرکاری نلکوں سے پانی حاصل کرنے کے لیے انھیں صرف ایک ''لوٹا'' پانی پلانا پڑتا ہے۔ غیر سرکاری نلکے کو ''گیڑتے'' ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی کوئی بے مقصد کام کر رہا ہے۔ حالاں کہ چند منٹوں بعد اس کی مقصدیت H20 کی شکل میں واضح ہو جاتی ہے۔ جب سے ہینڈ پمپ کا H غائب ہوا ہے، اس وقت سے صرف O2 رہ گئی ہے۔ پھر سرکاری نلکوں کا تعلق بھی ''واسا'' سے ہے۔ یعنی یہ وہ واحد ادارہ ہے جو ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے کرداروں کی طرح اسم بامسمّیٰ ہے۔ کیوں کہ ''واسا'' کے لفظ پر ''ہوا سا'' کا گمان ہوتا ہے۔

بقول اسرار اشفاق ؎

آج ٹونٹی کے لب خشک سے شوں شوں سن کر
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

سرکاری نلکے وزن میں ہلکے اور کارکردگی میں نہایت نالائق ہیں۔ سرکاری نلکوں کو اگر ''نالائق نلکے'' کہہ کر پکارا جائے تو نہ صرف ابلاغ کا مسئلہ حل ہوگا بلکہ صارفین کی رکی ہوئی طبیعتیں بھی نواب ٹیوب ویل کی طرح رواں ہو جائیں گی۔ سرکاری نلکوں کو کمیٹی والے نلکے بھی کہا جاتا ہے، وہ اس لیے کہ جب سے قوم کو پائپ کا پانی پینا اور ٹائپ کا حرف پڑھنا پڑا ہے، اس وقت سے شہر کے خاص و عام نے سرکار کے ہاں ایک مستقل کمیٹی ڈال رکھی ہے، جو ہر تین ماہ بعد نیشنل بینک کی کسی بھی برانچ میں لائن میں لگ کر جمع کرانی پڑتی ہے۔ سرکاری نلکوں کا پانی ٹینکیوں سے اتر کر قوم کی جانب سفر کرنے کی کوشش تو کرتا ہے مگر کہیں راستے ہی میں ''ہائی جیک'' ہو جاتا ہے۔ سرکاری نلکوں کی ٹونٹیوں سے ایک تو پوٹاشیم پرمیگانیٹ کی بو آتی ہے اور دوسرے ان کی تعلیم اتنی سرکاری ہوتی ہے کہ ان کے دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہوتا ہے۔ غرض جتنا عیش سرکاری نلکوں کے لیے بنا ہے، اتنا تو شاید تجمل حسین خاں کے لیے بھی نہیں بنا تھا کیوں کہ یہ اوائل عمری میں برانڈرتھ روڈ جیسے گراں قدر بازار کے شوروموں میں عیش کرتے ہیں۔ عالمِ شباب میں کوٹھیوں اور گھروں کے غسل خانوں میں نہانے والوں کی بے قراریوں پر ''کلیاں'' کرتے ہیں اور عالمِ پیری بلال گنج میں گرگِ ظالم کی طرح پرہیزگار بن کر گزارتے ہیں۔ سرکاری نلکے کے کان جب بھی مروڑے جائیں، اس کی ناک سے پانی کی بجائے یہ شعر برآمد ہوتا ہے۔

پُر ہوں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!

پھر راگ درباری شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد کچھ فکر انگیز اور مدھ بھری دھنیں تیار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ چوں کہ آدمی کپڑوں سے کفیتا آزادی حاصل کر چکا ہوتا ہے،

اس لیے سوچتا ہے کہ چلو جتنی دیر میں بدن پر پانی نہیں پڑتا، اتنی دیر میں روح کو غذا فراہم کرنے میں کیا حرج ہے؟ گرمیوں میں جب غسل خانے صحرائے گوبی اور ٹمبکٹو کی منہ بولتی تصویر بن جاتے ہیں تو آدمی شیطانی وطاغوتی قوتوں کا سہارا لے کر ٹونٹی کو کچا چبا جانے پر غور کرتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا۔ نلکے کے لچھنوں سے پتا چلتا ہے، کہ وہ نالیوں میں پانی کے دوڑنے پھرنے کا قائل نہیں۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ جو ٹونٹیوں سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے؟ اتنے میں آدمی کا جسم جب عرق عرق ہونے لگتا ہے تو وہ نالہ کرنا بھی شروع کر دیتا ہے۔ نہانے والا نہ صرف گا کر بلکہ وہ ''نیچ'' کے بھی نلکے یار کو منانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس موقع پر وہ انڈیا کے یہ گانے سنا کر نلکے کا دل پگھلانے کی سعی کرتا ہے۔ ایسے تڑپوں کہ جیسے جل بن مچھلی اور اب تو نیر بہالے۔ اے سرکار کے پالے!

ہمارے ہاں سرکاری نلکے پر لوگ اعتبار نہیں کرتے کیوں کہ اس کی آمد ورفت کے اوقات مقرر نہیں۔ گرمیوں میں تو نہانے والے اس کا طرزِ تپاک دیکھ کر ہی کھول اٹھتے ہیں۔ اس کی ذات۔ ابھی ہے، ابھی نہیں کے مصداق ہے۔ ایک دیہاتی جو تالابوں، نالوں، کھالوں اور ہینڈ پمپوں تلے نہانے کا عادی تھا، جب پہلی مرتبہ اپنے کسی عزیز کے ہاں شہر میں آیا تو اس نے اپنے عزیز سے پوچھا ''بھئی! ہمتھی والا نلکا کدھر ہے؟'' شہروں میں سرکاری نلکے ہوتے ہیں۔ یہ سامنے دفتر یعنی غسل خانہ ہے اور اس کے اندر سرکاری نلکا، سرکاری ملازم ہے۔'' دیہاتی نے سوچا کہ اگر وہ اپنے عزیز سے یہ پوچھے کہ نہاتے کیسے ہیں تو اس کی ہتک ہوگی، چناں چہ اس نے پہلے اپنے رشتے دار کے نہانے کا انتظار کیا۔ دیہاتی کا رشتے دار جب غسل خانے میں داخل ہو گیا تو اس نے کھڑکی کی درز میں سے جھانکا کہ آخر

سرکاری نلکے کے نیچے نہانے کے کیا آداب ہیں؟ اس وقت نلکا نہیں آرہا تھا۔ دیہاتی کا عزیز نلکے کے سامنے کبھی ہاتھ جوڑتا، کبھی اس کی ٹونٹی کو یوں چپاتا، جیسے ہڈی میں سے گودا نکالا جاتا ہے۔ وقفے وقفے سے وہ نلکے کی طرف منہ کر کے اسے اس مفہوم کے اشعار بھی سناتا.....

آدھی سے زیادہ شب غم کاٹ چکا ہوں
اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے

اتنی دیر میں شہری اپنے پسینے میں نہا گیا۔ اب اس نے تولیے سے پسینہ خشک کیا اور غسل خانے سے باہر آگیا۔ دیہاتی بھی غسل خانے میں داخل ہو کر اپنے عزیز کی طرح نلکے کی ٹھوڑی اور ناک کو چھونے لگا۔ اس نے نلکے کے ٹخنے اور پاؤں بھی چھوئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر آیا تو اس کے عزیز نے پوچھا۔ ''تم نے کیسے نہا لیا؟ پانی تو نہیں آرہا تھا۔'' دیہاتی بولا ''میں نے آپ کو نہاتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اسی طرح میں نے بھی نہا لیا۔'' جب مسجدوں میں اذان ہونے لگتی ہے تو ساتھ ہی یہ اعلان بھی شروع ہو جاتے ہیں کہ نلکوں میں پانی نہیں آرہا، نمازی حضرات گھر سے وضو کر کے آئیں اور گھر میں پانی نہ آرہا ہو تو پھر تیمم کر کے آئیں۔ نلکے شاید روزانہ اس لیے نہیں آتے کہ قدر رکھو دیتا ہے، روز کا آنا جانا۔ بعض اوقات نہانے والا غسل خانے سے باہر نکل کر یہ بھی نہیں بتاتا کہ وہ نلکے سے نہایا ہے یا شرم سے۔ ویسے نہانے والوں اور سرکاری نلکوں کا پردہ بھی ایک ہی ہوتا ہے کیوں کہ نہانے والا اس وقت ان کے پاس ہوتا ہے، جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ ہتھی والے نلکے اگر روزانہ ڈیوٹی پر حاضر نہ ہوں تو بندہ ان کے ہاتھ بازو توڑ کر کسی پھیری والے کے ہاتھ فروخت کر کے کھیلاں جتیے اور مروڈے بھی خرید کر سکتا ہے، جب کہ سرکاری نلکوں کو گورنمنٹ کے

پکے ملازم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ غسل خانوں کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے کہ عوام کو پانی دیں یا دو چار اشکِ ندامت ہی بہا کر دکھا دیں۔

اخبارات میں اس قسم کے اشتہارات روزانہ ہی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ فلاں فلاں تاریخ کو، فلاں فلاں علاقے کو پانی کی ایک بوند نصیب نہیں ہوگی کیوں کہ ان علاقوں کے لوگ پانی جیسی نعمت کی قدر نہیں کرتے۔ فلاں فلاں تاریخ کو ان علاقوں کو غلطی سے پانی بھیج دیا گیا تھا۔ مہینے کے آخر میں ان کے حصے کا پانی کسی مستحق علاقے کو سپلائی کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں باتھ روم صرف نہانے دھونے تک ہی محدود نہیں بلکہ گانے اور رقص کرنے جیسی سرگرمیوں کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ ایک روز ہم اپنے ایک دوست کے گھر گئے۔ وہ شاعر تھا اور آگ تخلص کرتا تھا۔ اس نے فوراً ہمارے لیے چائے کا انتظام کیا اور خود یہ کہ کر غائب ہوگیا کہ میرے تن بدن میں آگ سی لگ رہی ہے، میں ذرا نہا لوں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ باتھ روم سے باہر آیا لیکن اس کے بال خشک گھاس کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ آپ آئے تو نہا کر ہیں لیکن آپ نے سر کی آبیاری نہیں کی۔ اس نے بتایا کہ میں باتھ روم میں کبھی نہانے کی نیت سے داخل نہیں ہوا۔ اگر نلکا آ رہا ہو تو نہا لیتا ہوں وگرنہ ٹونٹی کو اپنا تازہ کلام سنانا شروع کر دیتا ہوں۔

یہ امرِ واقعہ ہے کہ تمام سرکاری نلکے سرکاری محکموں جیسے ہیں کیوں کہ یہ شوں شوں تو کرتے ہیں مگر کام نہیں کرتے۔ سرکاری نلکوں کے لیے ہم نے گھر کے دروازے چوپٹ کھول رکھے ہیں۔ اگر وہ اپنے سرکاری وقت میں سے کچھ وقت نکال کر گھروں میں آنے کی زحمت گوارا کر لیں تو ان کی عین نوازش ہوگی۔

بے چاری دیواریں

کسی زمانے میں شاعر حضرات دیواروں سے بڑا اُلجھا ہوا کام لیا کرتے تھے مثلاً محبوب کے ہجر و فراق میں دیواروں سے باتیں کرنا اور سر پھوڑنا، اگر محبوب گھر سے باہر نہ نکلتا تو اس کے گھر کی دیوار کے ساتھ آئینے کی طرح کھڑے ہو جانا اور اگر کوئی میر صاحب کی طرح زیادہ ہی آرام طلب ہوا تو وہ محبوب کے انتظار میں اس کے گھر کی دیوار کے سائے تلے کھڑا ہو جاتا تاکہ اسے وصل سے قبل ہی سن سٹروک نہ ہو جائے۔ مگر آج کل دیواروں کے ذمے اقوام و ملل کی بدآموزی کا کام ہے۔

دیواریں جہاں اشتہارات لکھنے اور چپکانے کے لیے بڑی موزوں ہیں۔ وہاں یہ ان گدھوں اور کُتوں کے لیے بھی بڑی مفید ہیں، جو چلتے چلتے دیوار کی آڑ میں اپنے فرغالِ مثانہ کی روداد لکھ جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بچے کو اپنی معصومیت اور بچپنا دور کرنے کے لیے کسی جہاں دیدہ شخص کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کرنا پڑتے بلکہ اس کی خدمت کے لیے ہزار ہا دیوار ہائے سایہ دار راہ میں ہے۔ ان دیواروں کو کالا کرنے والی کمپنیاں وہ ہیں، جو کالے علم کی کاٹ کی ماہر ہیں۔ یعنی جن کا کوئلوں کی دلالی میں خوب منہ کالا ہو چکا ہے۔ کمپنی کے مالکان اپنی کمپنی کی تمام کمزوریاں پکا سوسائٹی میں دیوار پر انڈیل دیتے ہیں۔ دیواروں پر مسائلِ حیات اور مسائلِ جبر و قدر اس خوب صورتی اور جامعیت

سے سمجھائے ہوتے ہیں کہ آدمی اس سوچ میں غرق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی خطوطِ غالب پر گزارے یا اختر و سلمٰی کے خطوط پر۔ آپ بس یا ویگن میں سفر کر رہے ہوں یا پیدل چل رہے ہوں۔ آپ اپنے دائیں بائیں کی تمام دیواروں کو اپنے دکھ سکھ میں برابر شریک پائیں گے۔

لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے آپ پر بہت سے راز از خود منکشف ہوتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک نوشتۂ دیوار ملاحظہ کیجئے...... الف دین مرچ مرچنٹ یہ اطلاع دینا اپنا قومی اور دینی فریضہ سمجھتا ہے کہ ہماری دکان کی مرچیں سو فیصد خالص ہیں۔ ہم لوگوں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکتے۔ ہم کھرا مال بیچتے ہیں اور کھوٹا اور ملاوٹ شدہ مال بیچنے والوں پر لعنت ملامت کے قائل ہیں۔ ہماری مرچوں کا نتیجہ ہنڈیا سے لے کر معدے تک ہمیشہ معیاری نکلتا ہے۔ ایک سیر اکٹھی مرچیں خریدنے والے کو ہینگ مفت۔ اس سنہری بلکہ سرخ موقعے سے فائدہ اٹھائیں۔ پہلے آئیں، پہلے پائیں!

ایک اشتہار اور ملاحظہ فرمائیے...... پہلی بار دولھا بننے والے متوجہ ہوں۔ بارات لے جانے کے لیے ہماری خدمات حاصل کیجیے۔ گھوڑے، ہاتھی اور بگھی کا بازار سے ارزاں انتظام۔ ہاتھی کا آرڈر ایک ہفتہ پہلے دیجیے۔ بریک ڈانس کرنے والی گھوڑی بھی دستیاب ہے، اس کے علاوہ فلمی ڈانس کرنے والی بچھیری بھی کرائے پر مل سکتی ہے۔

پہلی دفعہ میٹرک فیل طلبہ کے لیے گولیاں۔ ایک گولی۔ ایک سوال! ہم آپ کا دکھ درد سمجھتے ہیں۔ آپ ہی قوم کا مستقبل ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم ناقص ہے لیکن آپ کا حافظہ اور یادداشت بھی تو کمزور ہے۔ ہمارے مطب نے آپ کی سہولت کے لیے حافظے کی ایسی گولیاں تیار کی ہیں کہ آپ کو امتحان کی تیاری میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے

گی۔ایک گولی اور ایک سوال کے جذبے کے تحت ہمارا مطب آپ کا منتظر ہے۔پہلی مرتبہ میٹرک کا امتحان دینے والوں کے لیے فی شیشی دس روپے اور کمپارٹ حاصل کرنے والے طلبہ کو مزید رعایت۔

دیواری اشتہارات آنکھوں کے راستے اس سُرعت سے دل پر اثر کرتے ہیں کہ آدمی کو اپنے نیک اعمال بھی امراض کی صورت اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً شوگر کا علاج ایک ماہ میں، بواسیر کا علاج ایک ہفتے میں۔ایک بار آزما کر تو دیکھیں، کالی یا گوری کھانسی کا مکمل خاتمہ، قبض کُشا یا دِل کُشا گولیاں، محبوب آپ کے قدموں میں، آپ کے تمام راز پوشیدہ رکھے جائیں گے۔ہم دورانِ سفر دیواری اشتہارات پر اپنی آنکھیں اس لیے نہیں دھرتے کہ معززینِ علاقہ کہیں ہمارے تقوے پر ہی شک نہ کرتے پھریں۔ویسے اب ان اشتہارات میں ہمارے لیے کوئی چاشنی بھی نہیں کیوں کہ انھی دیواری اشتہارات نے ہمیں اپنی محبت کی گھنی چھاؤں تلے خوب پالا ہی نہیں بلکہ ڈھالا بھی ہے۔ہاں البتہ غیر لوگ ان اشتہارات کو کوہِ طور کا سُرمہ ڈال ڈال کر پڑھتے ہیں۔اس طرح غیروں کی نظر میں ہمارا بچہ بچہ منقولہ اور غیر منقولہ بیماریوں کا وارث ٹھہرتا ہے۔

اس وقت ان اشتہارات کا لطف دو آتشہ ہو جاتا ہے۔جب ان اشتہارات کی جگہ صوبائی، قومی اور بلدیاتی امیدواروں کا دردِ جگر اور دردِ قولنج قومی درد کے واٹر کلر میں دیوار پر مَل دیا جاتا ہے۔قومی اسمبلیوں کے امیدواروں کے جگر میں تو پوری قوم کا درد ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے نام کے ساتھ علامہ اقبال کے اشعار لکھوانا نہیں بھولتے۔مثلاً

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر، پہاڑوں کی چٹانوں میں

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

امیدواروں کی شہرت کی کلر سکیم اور مکھن پورہ سکیم میں بعض پینڑوں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اپنی طبیعت اور برش کے زور پر اس قسم کے اشعار کا بھی ایک آدھ ''کوٹ'' کر دیتے ہیں۔

خنجر چلے کہیں پہ تڑپتے ہیں ہم ''غریب''
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

صوبائی امیدواروں کا درد تو صوبے کی آخری محصول چونگی پر پہنچ کر عوام الناس کو خدا حافظ کہہ دیتا ہے، اس لیے وہ اپنے نام کے ساتھ جن اشعار کا انتخاب کرتے ہیں، ان کا کینوس بھی قدرے چھوٹا ہوتا ہے۔ مثلاً

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے

امیدوار بے خوف اور خنجر بلف جیسے محبت بھرے الفاظ لکھوا کر اپنے ووٹروں کے دل ایڈوانس ہی جیت لیتے ہیں۔ جب انتخابات اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں تو طبی اور سفلی اشتہارات دوبارہ دیواروں کی ''زینت امان'' بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب پہلے اشتہارات کی باقیات اور نئے اشتہارات کا سفوف کچھ یوں بنے گا۔ امیدوار فلاں فلاں۔ انتخابی نشان۔ شوگر۔ امیدوار فلاں فلاں۔ منشور۔ کالی کھانسی کا مکمل خاتمہ، غریبوں کا ہمدرد۔ ہمدرد گرائپ واٹر۔ اب کی بار۔ ڈار ہی ڈار، جب ڈار صاحب پر سفلی برش پھر جاتا ہے تو عبارت یوں نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اب کی بار۔ بواسیر کا علاج۔ بعض دفعہ ''آوے ای آوے'' کے آگے ''محبوب آپ کے قدموں میں'' لکھ کر سیاست کو محبت میں

بدل دیا جاتا ہے۔ زیادتی اس امیدوار کے ساتھ ہوتی ہے، جس کا نام تو دیوار پر رہنے دیا جاتا ہے مگر اس کے نجی اوصاف کی جگہ قبض، گنٹھیا اور رعشہ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے اشتہارات لکھوانے والی کمپنیوں کے مالکان کی روح کے اندر جب خیالات متلاطم ہوں تو انھیں اپنے کردار و گفتار کے اُسلوب پر قابو نہیں رہتا۔ ان کی نگہ اتنی بلند اور جاں پُرسوز ہوتی ہے کہ وہ زمین و فلک، پہاڑ، دریا، سورج اور چاند کو بھی اشتہاری قرار دیتے ہیں۔ ان کے بس میں ہو تو یہ کپڑا بنانے والی ملوں کے ساتھ مل کر کپڑوں کے ایسے ایسے نمونے تیار کروائیں، جن میں سے کسی پر تو چین ہیلتھ ہوم لکھا ہو اور کسی پر اس قسم کی ''بیعت بازی''

''اس قوم کے امراض ہیں حد درجہ خطرناک''

جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

اس سرمۂ طوری سے ہے روشن یہ زمانہ

گولی ہو کہ کیپسول سب ابلیس کی ایجاد

جگہ جگہ اس قسم کے اشتہارات دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ حبیب بینک پلازہ، سٹیٹ بینک کی عمارت، جی پی او، الفلاح بلڈنگ، واپڈا ہاؤس، غیر ملکی سفارت خانے اور اس ٹائپ کی ''متحدہ عرب عمارات'' ان کے چغتائی آرٹ سے کیسے بچ گئیں۔

بادلِ نخواستہ

زیرِ نظر کتاب ''بادل اور بجلی'' میرے ہاتھوں کے کشکول میں ہے۔ اس کے شاعر بادلِ نخواستہ پانی پتی ہیں۔ شاعر موصوف نے اپنی نابالغ عرق ریزی کا تیر بہدف نسخہ ہی ہماری جانِ ناتواں کے لیے کافی نہ سمجھا بلکہ انھوں نے خطوطِ غالب سے مغلوب ہو کر ایک بیرنگ خط بھی ہمیں ارسال کیا ہے۔ اگر ہم بندۂ خاکی المشہو رڈاکیے کے سامنے ہی خط کھول لیتے تو ''لینے سے انکاری ہے لہٰذا واپس جاوے'' لکھوا کر شتابی سے فارغ ہو جاتے۔ قبل اس کے کہ ہم اپنا معیاری وقت، قیمتی غصہ، وٹامن اے اور ڈی سے بھرپور انرجی اور تلوار سے زیادہ خطرناک قلم کی سیاہی بادلِ نخواستہ صاحب کی شاعری پر ضائع کریں۔ ہمارا یہ قومی فرض بنتا ہے کہ ہم سب سے پہلے آپ کی توجہ کتاب کے غیر ضروری حصوں کی طرف مبذول کروائیں۔ کتاب کے ٹائیٹل کے بالائی حصے پر ''بادل اور بجلی'' لکھا گیا ہے۔ بادل اور بجلی کے نیچے منگلا ڈیم کی جھیل سے گرنے والی آبشار دکھائی گئی ہے۔ جھیل کے اوپر کالے بادل ہیں، جن پر بادلِ نخواستہ لکھا ہے۔ ٹائیٹل کے دامن میں گرڈ اسٹیشن ہے، جس کے عین وسط میں نسل در نسل پبلشرز درج ہے۔ ٹائیٹل کے اندر دو کورے کاغذ اس لیے چھوڑ دیے گئے ہیں تاکہ کورذوق قاری کھانا کھانے کے دوران میں انھیں بطور ٹشو پیپر استعمال کر سکے۔ کورے کاغذوں کے اگلے صفحے پر قاری کا حافظہ چیک کرنے کی خاطر دوبارہ بادل اور بجلی،

بادلِ نخواستہ پانی پتی اور نسل در نسل پبلشرز لکھا گیا ہے۔ اسی صفحے کی پشت پر کچھ اس قسم کا کاٹھ کباڑ لادا گیا ہے۔

جُملہ حقوق تا قیامت بحقِ سسرال مدفون ہیں۔

ٹائٹیل : تذبذب رقم ابنِ رقم

خطاطی : عطائے الٰہی

تصویر : کوڈو فلمز

پرنٹر : تھرڈ ریٹ پریس پرانا لنڈا بازار

ناشر : نسل در نسل پبلشرز

اگلے صفحے پر یہ انتساب مصنف کے جیب خرچ پر خواہ مخواہ ستم ڈھا رہا ہے:

''اس رقیبِ روسیاہ کے نام جو اکثر سفید ہاتھ نما فوجی موٹر بائیسکل پر محبوب کی بجائے میرے ناقص نقوشِ پا کا ''دکھوجی'' ہے۔''

اس کے بعد شاعر کی ذہنی، قلبی، نسلی، محلاتی، اور جدلیاتی وارداتوں کی فہرست ہے اور اس کے بعد غزلیات۔

بادلِ نخواستہ صاحب نے اپنی ایک ہٹ غزل کے ذریعے ہمیں مطلع کیا ہے کہ عشق کرنے کے لیے سب سے پائیدار، سبک رفتار اور سستی سواری ایگل سائیکل ہے۔ شاعر نے جہاں ایگل سائیکل کا ذکر کر کے عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف ٹائر قدمی شروع کی ہے، وہاں اس غزل میں قاری کو کھٹکنے والی چیز اس کے کیریئر کا فقدان ہے۔ کیریئر کے نہ ہونے کی وجہ سے غزل میں رکیکیت اور سوقیت چپکے سے در آئی ہے۔ بادلِ نخواستہ صاحب

نے کیریئر اتروانے والی غلطی دانستہ کی ہے کیوں کہ وہ محبوب کو سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر اپنا ہم سفر بنانا چاہتے ہیں۔

بادلِ نخواستہ صاحب کی نمائندہ غزلوں میں سے ایک غزل میں اس بجلی کا بڑا ذکر ہے، جس کی کمی وطنِ عزیز کے گوشے گوشے میں محسوس کی جارہی ہے۔ یہ غزل اس لحاظ سے بڑی جان دار ہے کہ اس پر شہادت کی انگلی رکھتے ہی بڑے زور کا کرنٹ پڑتا ہے۔ بادلِ نخواستہ صاحب نے غزل کے نیچے ''پاؤں نوٹ'' دیا ہے کہ غزل میں غرق ہونے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرلیں کہ آپ نے ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں پہن لی ہیں۔ اگر کوئی قاری اس غزل کی قرأت کے دوران اللہ میاں کو پسند آ گیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

بادلِ نخواستہ صاحب نے اپنی ایک اور غزل میں نیلے پیلے اور کالے پتھروں کا استعمال ہاتھ کھول کر کیا ہے۔ مطلع سے مقطع تک قاری کی کھوپڑی پر پتھر ہی پتھر پڑتے جاتے ہیں۔ القصہ یہ غزل فنی اعتبار سے بڑی مضبوط اور پختہ ہے کیوں کہ پتھریلی اور سنگلاخ زمینوں میں اپنی غزل کا سبزہ اگانا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا کہ سانگلہ ہل کی آب وہوا میں صحت افزائی عناصر تلاش کرنا۔ ادبی اصطلاح میں اسے پتھریلی غزل کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اتنا پتھر تو شاید ابوالہول کی ناک پر بھی صرف نہ ہوا ہوگا۔

بادلِ نخواستہ صاحب کی غزلوں میں ایک غزل ایسی ہے، جس کی تعمیر میں ریت ہی ریت مضمر ہے۔ بادلِ نخواستہ نے ریت کا مطلع بنا کر قاری کے منہ پر اس طرح مارا ہے کہ وہ بقیہ غزل خود ہی کہہ سکتا ہے۔ ریت قاری کی آنکھوں میں اس طرح سرایت کرتی ہے کہ اس کے خشک ریتلے اشکوں کو گنا ہی نہیں، تولا بلکہ برآمد بھی کیا جاسکتا ہے۔ قاری کے فیملی

آئی سپیشلسٹ نے پولیس کو اطلاع دی ہے کہ وہ آئندہ بادلِ نخواستہ صاحب کی ریتلی غزلوں کا ریمانڈ حاصل کر کے کسی بھی تھانہ محرر سے ایڈٹ کروایا کرے۔

بادلِ نخواستہ صاحب کی نمائندہ غزلوں میں ایک غزل ایسی بھی ہے، جسے ہئیت کی رو سے خونی غزل بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس غزل میں محبوب کی طرف سے خنجروں، شمشیروں اور تیروں کے بھرپور وار ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کند ذہن محبوب نے جتنا بھی سامانِ حرب وضرب استعمال کیا ہے، وہ سب کا سب کند ہے۔ بادلِ نخواستہ نے اپنے محبوب کے کند اوزاروں کی تکلیف کا ذکر کر کے جہاں اپنے کاتب، پبلشر اور بائینڈر کی ہمدردیاں تیس فیصد کمیشن پر حاصل کی ہیں، وہاں اس کا اثر قصائی برادری پر بھی بہت ہوا ہے۔ قصائی برادری نے تو بادلِ نخواستہ صاحب کے حق میں ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ اگر بادلِ نخواستہ صاحب ایک مرتبہ ہمیں اپنے محبوب کا چہرہ کرا دیں تو ہم اس کا قیمہ آلوؤں اور کریلوں میں ڈال کر ادب کے ہدہدوں کو کھلا دیں گے۔ اس خونی غزل پر تنقید تو نہیں کی جا سکتی، البتہ ہم اپنا منہ وکی رضائی میں دے کر صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ بادلِ نخواستہ قدیم شعراء کی طرح آج بھی خنجروں، تیروں اور شمشیروں کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے قارئین کو بڑے ترینے سے بدظن کرتے جا رہے ہیں۔ اگر آئندہ وہ سکڈ میزائلوں اور پیٹریاٹ میزائلوں وغیرہ کو اپنے کلام کا حصہ بنا لیں تو ان کی شاعری میں نہ صرف عسکری رنگ پیدا ہو سکتا ہے بلکہ ان کی شاعری کہیں سے کہیں اور پھر وہیں پہنچ سکتی ہے۔

بادلِ نخواستہ صاحب کی دیگر غزلیات کے مطالعے سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انھیں دردِ جگر اور دردِ دل جیسی امیرانہ اور جان لیوا بیماریوں نے صرف ڈاکٹروں کے بال بچوں کی روزی کی خاطر اپنے نرغے میں پھنسا رکھا ہے۔ محبوب کی گلی کے پھیرے لگا لگا

کران کا سر گنجا اور پاؤں میں چھالے پڑ چکے ہیں۔ سائیکل چلا چلا کر ان کی ٹانگوں میں میٹھا میٹھا خواجہ میر درد بھی ہوتا ہے۔ بادلِ نخواستہ صاحب کا معدہ بھی محبوب کے ہجر و فراق میں متعدد بار گڑ گڑ ایا ہے۔ لبلبے نے بھی محبوب کو شوکاز نوٹس دیا ہے۔ مثانوں نے بھی کئی بار محبوب کو لعل و یاقوت کا لالچ دیا ہے۔ گُردوں نے بھی محبوب کو ڈیوٹی پر حاضر کرنے کے لیے پیاس ہڑتال کی ہے مگر بادلِ نخواستہ صاحب اپنی شاعری میں سوائے اعضائے رئیسہ کے اور کسی کو شتالا ہی نہیں ڈالتے۔ اگر اعضائے رئیسہ کو اسی رفتار سے پروجیکشن ملتی رہی تو اعضائے کمینہ میں احساسِ محرومی اتنا بڑھ جائے گا کہ بادلِ نخواستہ خدانخواستہ خدا ہی کو پیارے ہو جائیں گے۔

کتاب کے آخر میں بادلِ نخواستہ صاحب نے تساہلِ عارفانہ کے پیشِ نظر اپنی تصویر چارپائی پر لیٹ کر اتروائی ہے جس میں ان کا طُرّہ، حُقّہ اور کھُتّہ بالخصوص نمایاں ہیں۔ چارپائی کی ادوائن ان کے علمِ عروض کے بوجھ کی بدولت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ چارپائی کے نیچے بادلِ نخواستہ صاحب نے نہ صرف اپنا مشغلہ بتایا ہے بلکہ انھوں نے اپنے کاتب، پبلشر، پرنٹر اور بائینڈر تک کے مشاغلِ حیات بھی گنوا دیے ہیں۔ اس کتاب کا وزن آدھ کلو یعنی دو پاؤ یعنی آٹھ چھٹانک یعنی چالیس تولے یعنی چار سو ماشے یعنی 3840 رتی ہے۔ قیمت: منفی تیرہ آنے۔ اسے گدڑی کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور قارئین کی مٹھی چاپی کے لیے ایک خالی سفید کاغذ کا "چاپنا" بھی لگوایا گیا ہے۔ اُمید ہے آپ اسے اپنی لائبریری کے لیے آج ہی منہ مانگی قیمت پر خریدیں گے تاکہ باقی کتابوں کو کسی کتابی کیڑے کی نظرِ بد نہ لگے۔

❁❁❁

غالب.....کلاس روم میں

ایک استاد کمرۂ جماعت میں نہار منہ اپنے ہونہار شاگردوں کو غالب کے فکر وفن پر لیکچر دے رہے تھے کہ ایک شخص سر پر ٹوپی پہنے اور ہاتھ میں دیوانِ غالب کا نسخہ اٹھائے کمرۂ جماعت کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ ''آیئے آیئے حضور! آپ آئیں'' ہماری کلاس میں خدا کی قدرت ہے۔ کبھی ہم آپ کو'' کبھی اس کلاس کو دیکھتے ہیں۔''

استاد صاحب بڑے ادب سے بولے۔ استاد جی'' یہ بات آپ نے کیا کہی۔ ''غالب بولے

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

'' آپ کی کلاس بازیچۂ اطفال دکھائی دے رہی ہے''۔ ''جی سر۔ یہ فرسٹ ایئر کی کلاس ہے''۔ استاد صاحب نے کہا۔ استاد جی!'' مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ انھیں غالب اس طرح پڑھاتے ہیں کہ انھیں زندگی ہی میں مرگ کا کھٹکا لگ جائے اور اُردو کا پیریڈ پڑھنے سے قبل ہی ان کا رنگ زرد پڑ جائے''۔ غالب نے کہا۔'' ویسے بھی اب کچھ طلباء پر نیند غالب ہے اور کچھ زیرِ لب اونگھ رہے ہیں۔ ان کے قسم ہائے پنہاں سے یوں لگ رہا ہے، جیسے اُردو کا پیریڈ یہ اپنے پروفیسر کی کلاس میں سو کر پڑھتے ہیں''۔ یہ کہہ کر غالب کلاس

سے کچھ یوں مخاطب ہوئے۔ ''آج میرا فرسٹ ایئر سے وصال ہے۔ میں تو آج خوشی سے مرجانا چاہتا ہوں''۔ ''سر! ہمارے استاد تو فرسٹ ایئر کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں اگر فرسٹ ایئر ہی تھی تو دل بھی یارب کئی دیے ہوتے''۔ ایک طالب علم بولا۔ شاید آپ کے اساتذۂ کرام کو میرے اس شعر سے اختلاف ہو:

زخم پر چھڑکیں گے کیا طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

استاد صاحب نے ایک دم غالب سے یہ سوال کیا۔ ''حضور! آپ کے زمانے میں تو لوگ آپ کو سمجھے ہی نہیں۔ اس دور میں لوگوں نے آپ پر لکھا بھی ہے اور آپ کو کھولا بھی۔ کیا آپ مطمئن ہیں یا ابھی آپ کچھ اور کھلنا چاہتے ہیں''۔ سب سے پہلے تو مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اسیر عابد صاحب نے میرے کلام کا پنجابی میں منظوم ترجمہ کر کے مجھے مغل آرٹ سے نکال کر شاہ نوری آرٹ کا جزوِ لاینفک بنا دیا ہے۔ اب میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں اقبال بن جاؤں۔ جیسے ''اقبال ڈے'' کے موقع پر عام تعطیل ہوتی ہے'' اسی طرح ''غالب ڈے'' پر بھی چھٹی ہونی چاہیے۔ اسی بہانے میں طلبا کو کم از کم چھٹی کے دن تو یاد آیا کروں گا۔ جیسے شاہراہوں پر اقبال کی قدِ آدم تصاویر نصب کی جاتی ہیں، ویسے ہی میری تصاویر بھی نصب ہونی چاہییں..... ابوالاثر حفیظ جالندھری کے ترانے کو تو پوری پاکستانی قوم کھڑے ہو کر سننے پر مجبور ہے۔ میری کسی غزل پر پوری قوم کو اگر بیٹھنے کا ہی پابند کر دیا جائے تو میری روح خوش ہو جائے گی''۔

''سر! آپ ہمارے کالج کیسے پہنچے؟ حالاں کہ لاہور میں تو بڑے بڑے کالج موجود ہیں''۔ ''استاد جی! غریب کا غریب ہی دوست ہوتا ہے۔ پھر یہاں کے طلبہ اکثر

تھرڈ ڈویژنر ہوتے ہیں جو واقعتاً علم وادب کے رسیا ہوتے ہیں۔ پھر اس لیے بھی میں نے آپ کے کالج میں قدم رنجہ فرمانا ضروری سمجھا کہ آپ کے طلبہ کے ناز و ادا اور طور اطوار میرے پرسنل محبوب سے کافی مشابہ ہیں۔ مثلاً آپ کے طالب علموں کا تعلق زیادہ تر دیہات سے ہے، اس لیے پروفیسر صاحبان کو بھی ''ہر ایک بات پہ کہتے ہیں وہ کہ تُو کیا ہے؟'' پھر یہ طلبہ اس لہو کے قائل نہیں، جو رگوں میں اندھیرا کر دیتا ہے بلکہ یہ اس لہو کو پسند فرماتے ہیں، جو بائیکاٹ کے روز شیشوں کو شہید کرنے سے ایک دوسرے کے جسموں سے نکل کر پولیس کے لہو کو گرما دیتا ہے''۔ ''حضور! آپ ہمارے کالج کس رستے سے آئے ہیں؟'' استاد صاحب نے غالب سے پوچھا۔ ''استاد جی! غالب بولے۔ پہلے تو میرے جی میں آئی تھی کہ ویگن سے اتر کر سید ھا شالامار باغ میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ بلبلیں خواہ مخواہ میرے نالے سے غزل خواں ہو جائیں گی۔ اس طرح گورنمنٹ شالیمار کالج کے مقابلے میں غالب دبستان کھل جائے گا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے آپ کے کالج میں آ کر اپنا وقت ضائع کیا ہے بلکہ مجھے تو اپنے شعروں کی سچائی کا اب اندازہ ہوا ہے''۔ مثلاً میں نے برسات کے دنوں میں ایک شعر کہا تھا، جسے لوگوں نے بھرتی کا شعر کہہ دیا تھا۔

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

آپ کے کالج کے گرد پانی بھی کھڑا ہے اور اس پر کائی بھی جمی ہوئی ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ لوگوں نے میرے شعر کو تو کچھ نہیں کہا تھا بلکہ انھوں نے کھڑے پانی میں بھرتی یا ملبہ ڈالنے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر مجھے اپنے ایک اور شعر کی آفاقیت کا علم ہوا بلکہ مجھے تو یوں لگا، جیسے یہ میں نے کہا ہی آپ کے کالج کے لیے تھا''۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

''استاد جی! کوئی اور سوال''۔ غالب نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ''سر! استاد صاحب فوراً بولے۔ آپ کا محققین اور تنقید نگاروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' استاد جی یہی سوال میرے ذہن میں بھی تھا۔ ''اس سوال پر تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر میں مختصراً عرض کروں کہ آج کل کے محققین اور تنقید نگار اپنے آپ کو قانون گو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تین چار سال قبل مجھ پر ایک صاحب نے کتاب لکھی تھی، جو میری غربت و عُسرت کا سہارا لے کر مجھے شاعر کی بجائے اداکار ثابت کر کے کسی اُردو فلم میں کام دلانا چاہتے تھے''۔

''سر! آپ نے اپنے اشعار میں شراب کا بھی بہت ذکرِ خیر کیا ہے۔ ایسے اشعار کی تشریح میں ہمیں کیا کرنا چاہیے''۔ ''ہاں! سوال تو بڑا نازک ہے۔ چلیں آپ کی خاطر عرض کیے دیتا ہوں۔ میرا یہ شعر ہے:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس شعر میں لوگ جو منکر نکیر ہوتے ہیں، انھوں نے ''مے'' کو شراب کے معنوں میں لیا ہے۔ حالاں کہ میں نے اپنے شعر ''مے'' کو بھینس کے معنوں میں باندھا ہے۔ بس اس میں یہ تھا کہ وہ بھینس میں نے قرض پر خریدی تھی اور آپ کو علم ہی ہے کہ قرض فاقہ مستی ہی کا دوسرا نام ہے۔'' ایک شعر اور ہے۔

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

اس شعر میں اگر چہ شراب کا ذکر ہے مگر اس کے ساتھ ہی میں نے حکمت کی رو سے اپنا مزاج بلغمی بتا دیا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور شعر ہے۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

اس شعر کی تشریح کچھ یوں ہے کہ شراب تو میری بچپن ہی سے چھٹی ہوئی تھی یعنی میں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ بارش کے روز مجھے سردی بہت لگتی تھی، اس لیے میرے حکیم صاحب نے مجھے اس کی اجازت دے رکھی تھی۔ ایک روز حکیم صاحب نے میرا نسخہ سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ بڑے شاعر بنے پھرتے ہو۔ اس نسخے پر شعر کہو۔ میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا"۔ ایک شعر اور سنیئے۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

"اسی شعر میں میں نے شراب کا لفظ گنے کے رس کے معنوں میں لیا ہے۔ اگر کوئی ستم ظریف گنے کے رس سے شراب بنا لے تو میرا کیا قصور؟ استاد جی! میں نے شراب کو ہمیشہ بُرا سمجھا اور اس کے خلاف میرا یہ شعر زبان زدِ عام و خاص ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

"سر! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نئی نسل کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں"۔ میں

تو نئی نسل کو بہت سے پیغامات دینا چاہتا تھا۔ جیسے ایک آدھ پیغام حاضرِ خدمت ہے۔ آپ کے اساتذہ بڑی محنت اور لگن سے پڑھاتے ہیں۔ اگر وہ ضد کی وجہ سے اپنے پاؤں لگن سے باہر کھینچیں تو آپ ان کے پاؤں دھو دھو کر پئیں کیوں کہ میرا بھی یہ وتیرہ رہا ہے''۔

غالب مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

نصیحتیں

آپ پیارے طالب علم ہیں اور امید ہے کہ ہمیں دیر تک پیارے رہیں گے۔ کسی زمانے میں ہم بھی آپ کی طرح طالب علم تھے۔ اب چوں کہ ہم کافی لکھ پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے ہمیں علم کی اتنی طلب نہیں رہی، جتنی آپ کو ہے۔ بہر حال ہم آپ کو اتنی نصیحتیں کریں گے کہ آپ ان نصیحتوں پر عمل ہی نہیں کر سکیں گے۔

ہم اپنی پہلی نصیحت کو آپ کے بالوں میں چھڑکتے ہیں۔ مثلاً آپ بال ایسے رکھیں کہ ہر کوئی یہ کہے کہ آپ نے کیا رکھا ہے؟ لوگ یہ کہیں کہ آپ نے کچھ نہیں رکھا اور سر یہ کہے کہ آپ نے کچھ تو رکھا ہے۔ کیوں کہ بالوں کا بوجھ جونہی سر پر پڑے، بال بال نہیں رہتے، وبال بن جاتے ہیں۔ صرف بالوں کی بات نہیں، اب تو لڑکوں میں بالیوں کا رجحان بھی پایا جا رہا ہے۔ بعض تو اپنے بالوں کے شدید رجحان کے حق میں یہ کہتے ہیں کہ ایک تو سر چوٹ وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے، دوسرے، ایسے سر کی قسم بھی با آسانی کھائی جا سکتی ہے اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی پرندہ اس میں گھونسلہ وغیرہ بنا لے تو اسے کرائے پر چڑھا کر بالائی آمدنی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے گنجلک سر کی قسم کھائی یا نہ کھائی جائے، حجامت والے دن اس کی ''باسکٹ بال'' ضرور بن جاتی ہے۔

آپ اپنے بالوں کو ان کے حال پر قطعاً نہ چھوڑیں، کہیں آپ کا مستقبل

عارف لوہار کے مشابہ نہ ہو جائے۔ لمبے بالوں کے لیے کنگھی فیل اور کنگھا پاس ہے، اس لیے کنگھا اٹھائے اٹھائے پھرنے سے بہتر ہے کہ بالوں کی مقدار ہی اتنی رکھی ہو کہ.....

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے؟ تو چھپائے نہ بنے

بچوں اور بلیوں کی خوراک دودھ ہے جب کہ بالوں کی افزائش کے لیے تیل ضروری ہے۔ جس حساب سے بال تیل مانگتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ بندے کا ذاتی کولہو ہو۔

آپ جب لمبے بالوں کو کٹوائیں گے تو خواہ مخواہ پچھتائیں گے۔ کیوں کہ آپ کے لاشعور میں یہ بات ضروری ہوگی کہ حجام نے اُجرت کے پیسے بھی لے لیے اور بال بھی اور آپ کے ہاتھ کیا آیا؟ فقط، ایک عدد سر۔ اس لیے علمِ معاشیات کے مطابق بال اتنے رکھیں کہ کٹواتے ہوئے یہ خیال نہ آئے کہ آپ کے بے رنگ بالوں سے حجام نے ہاتھ رنگ لیے ہیں، جس سے اس کا ''رنگ محل'' آسانی سے تیار ہو سکتا ہے۔ البتہ قلموں اور مونچھوں کی خوش خطی کا دھیان ضرور رکھیں بلکہ اس معاملے میں اگر آپ اخبارات کے معزول کاتبوں سے رجوع کریں تو یہ آپ کے حق میں اور بھی نیک فال ہے۔

بالوں کی خط و کتابت کے لیے کبھی فلمی ستاروں کی نقل نہ کیجیے کیوں کہ وہ کبھی کبھی ٹنڈ بھی کروا لیتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے پیشانی کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے اور نیچے صرف دو لکیریں سی رہ جاتی ہیں، جن سے فلمی ستارے صرف اشارے ہی کر سکتے ہیں۔

بال چھوٹے ہوں گے تو آپ ان میں بار بار انگلیاں نہیں پھیریں گے، جس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ کے ناخن اس میل کچیل سے پاک رہیں گے، جو لاہور کی گرد آلود فضا کا تحفۂ خاص ہے، دوسرے، کوئی اس شک میں نہیں پڑے گا کہ آپ اسے سلام کر رہے

ہیں۔

ہم اپنی دوسری نصیحت کو آپ کے لباس میں چھوڑتے ہیں۔ آپ بے شک سمور و کتاں پہنیں مگر ایسا کوئی لباس زیب تن نہ کریں، جس سے آپ کی شخصیت اور عقل پر پردہ پڑ جائے۔ بعض تو اس نوعیت کے کپڑے پہنتے ہیں کہ غالب شلوار پہن کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

گنجینۂ پتلون کو تو کچھ نہ سمجھئے
جتنا مزا غالبؔ مجھے شلوار میں آوے

مومن کی یہ پہچان ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا لیکن ہمارے طلبہ شلوار کے دو سوراخوں سے روزانہ ہی ڈسے جاتے ہیں۔ ان کی شلواروں کے پائنچے اتنے کھلے ہوتے ہیں کہ انھیں کھولنے سے شامیانہ بن جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ طلبہ لمبے چوڑے گھیرے والی شلواریں پہنتے ہیں یعنی پانچ پانچ گز کی شلواریں۔ پہلے مردانہ اور زنانہ ورائٹی الگ الگ ہوتی تھی۔ اب صرف کپڑے کے حصے میں ورائٹی آتی ہے۔ مردانہ اور زنانہ ذوق آپ کی طبیعت میں ہونا چاہئے۔ بعض اوقات ایک ہی کلاس نے سبز شلواریں پہنی ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے طلبہ اپنی شلواروں کے سبز باغ دکھا رہے ہیں۔

شلوار بہت اچھا لباس ہے مگر بعض طلباء صبح صبح جلد بازی میں اس میں ایسے ایسے ازار بند ڈال لیتے ہیں، جن کی شکل و شباہت عروسی ہوتی ہے۔ ان ازار بندوں سے اللہ کے بندوں کی خاصی دل آزاری ہوتی ہے۔ بعض تو غالب کی پیروی میں نالے کی جگہ رسہ ہی ڈال لیتے ہیں۔ عموماً شاعروں کے نالے آسمان کو جاتے ہیں، جب کہ طلباء اپنے نالوں کو اتنی لاپروائی سے پابندِ شلوار کرتے ہیں کہ ان کے نالے زمین بوسی کرتے ہیں اور لگتا ہے۔

ترے "ازار بندوں" کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا

جو بچے پتلونوں کے عادی ہیں، وہ ایک نہیں، دو پتلونیں پہن کر کالج سکول جائیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ جین کی پتلون پہننے میں ناغہ نہ ہو جائے۔ انھوں نے جین کو نصاب میں شامل کر رکھا ہے۔ کیوں کہ ہماری نظروں سے ایسے ایسے پتلون پرست گزرے ہیں، جن کی تصویر ہماری نگاہوں میں تادمِ تحریر محفوظ ہے۔ اصول یہ ہے کہ پتلون کو ناف کے قرب و جوار میں پہنا جائے۔ ایک پتلون پرست کا حال یہ دیکھا اس خدا کے بندے نے اپنی پتلون کو ایسی غیر یقینی جگہ پر ٹانکا تھا کہ ہم اس کے ہر گام پر ڈرتے تھے کہ پتلون کو اب زوال آیا۔

چند دن پہلے، ہم نے اپنے ایک شاگرد کو آموختہ سنانے کو کہا۔ اس نے ٹائی باندھ رکھی تھی۔ جب اس کے حلق سے ٹائی زدہ آواز برآمد ہوئی تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ سبق نہیں سنا رہا، ہچکیاں لے رہا ہے۔

یہ دور ٹھوس اور گیس کی بجائے مائع کا دور ہے۔ یہ مائع وہ ہے جو سوتی کپڑوں کو اتنے اہتمام سے لگائی جاتی ہے کہ پہننے والا نماز پڑھنے سے بھی کتراتا ہے۔ مائع تیرے تین نام۔ پرسی، پرسا، پرس رام۔ مئی جون کے مہینوں میں آدمی کو دس بجے "پرسی" آتی ہے، بارہ بجے پرسا اور دو بجے تک اس کا بدن مکمل طور پر پسینے کا اقرار کر لیتا ہے یعنی وہ مکمل "پرس رام" ہو جاتا ہے۔ انار کلی بازار میں بڑے بڑے شرفاء اور بڑی بڑی اشرفیوں کو ہم نے اس لباس میں بے لباس ہی دیکھا ہے۔ ایسے لوگوں کی اکڑ جوں کی توں رہتی ہے۔ کوئی کرسی پیش کرے، وہ نہیں بیٹھتے۔ ہاں موڑھا پیش کیا جائے تو ایسے بیٹھتے ہیں، جیسے ڈارون کے نظریے کو تقویت پہنچا رہے ہوں۔ مائع والا طالب علم موٹر سائیکل پر سوار ہو جائے تو یوں

دکھائی دیتا ہے جیسے اس نے اور موٹر سائیکل نے مشترکہ لباس پہنا ہوا ہے۔ آج کل کے طلبہ کو ایک تو اپنے کیریر (مستقبل) کی کوئی فکر نہیں، دوسرے فیشن کے طور پر اپنے موٹر سائیکل کا کیریر بھی اتروا دیتے ہیں۔ کلف والا سوٹ پہن کر اگر ایسی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ریڈ لائٹ اور نمبر پلیٹ موٹر سائیکل کو نہیں، بندے کو لگی ہوئی ہے اور ایسی موٹر سائیکل پر کوئی ناقص العقل سواری بیٹھی ہو تو پیچھے آنے والی کامل العقل سواریوں کی آنکھیں روشن اور سفر خوش گوار ہو جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں یہ شکایت عام ہے کہ بچوں کی لکھائی خراب ہے۔ کیوں نہ ہو؟ جب بال اپنے ہاتھ میں بال پوائنٹ لے کر پیدا ہوں گے تو ان کی لکھائی استاد نہیں، کیمسٹ سمجھے گا۔ کسی زمانے میں بچے سرکنڈے کی قلمیں گھڑتے اور پھر تختیاں لکھتے۔ سکول ٹائم میں قلمیں چلتیں اور چھٹی کے بعد تختیاں۔ اس طرح بچوں کے ہاتھ اور سر بیک وقت پختہ ہو جاتے۔ یہ مناظر دیکھ کر استادوں کو اپنے عزیز شاگردوں کی خوش خطی اور پختہ یادداشت کی پیش گوئی کرنے میں بے حد آسانی رہتی۔ اب تو بالوں کا مستقبل مکمل بال پوائنٹ میں ہے۔ ان کا بس چلے تو یہ ''نالے پانیوں'' میں Refill ڈلوالیں۔ اگر تعلیمی اداروں میں بال پوائنٹ اسی رفتار سے چلتی رہی تو ملک کنڈکٹروں، عرضی نویسوں اور اشتہام فروشوں میں خود کفیل ہو جائے گا۔ بال پوائنٹ کا دم غنیمت ہے، ایک دن یہی بال پوائنٹ تنزل کے زینے طے کرتی، جب کچی پنسل میں بدل جائے گی تو ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہے گی، کیوں کہ ہمارا لکھا ہوا آخری نہیں ہوگا اور ہمارے فیصلے اور معاہدے کسی ربڑ کے بھی محتاج نہیں ہوں گے۔

ہم نے بچپن میں پڑھا تھا کہ ''رب رب کر، استاد کا کہا مان!''۔ آج کل کے طلبہ کی وجہ سے استاد بھی رب رب کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کا کہا سوچ سمجھ کر مانتے ہیں۔

استاد انھیں سارا سال اس نیت سے پڑھاتے ہیں کہ وہ انھیں کا پڑھایا ہوا لکھیں گے، مگر جب ان کی امتحانی کاپیاں جانچی جاتی ہیں تو جو فاسد مواد سامنے آتا ہے، وہ واضح طور پر تھڑا مار کہ خلاصوں سے ماخوذ ہوتا ہے، جس پر ''عش عش'' کرنے کے علاوہ بے ساختہ ''غش غش'' کھانے کو بھی جی چاہتا ہے۔

ایک لڑکے نے حوالۂ متن میں خواجہ حیدر علی آتش کو غلام حیدر آتش لکھا تھا۔ ہم نے سوچا کہ غلام حیدر وائیں مرحوم و مغفور ہی لکھ دیتا تو کم از کم ایک شخصیت تو واضح ہو جاتی اور اُردو ادب اس نئے تنقیدی زاویے سے مالا مال ہو جاتا۔ ایک طالب علم نے ماما عظمت کو ماموں عظمت اور ڈپٹی نذیر احمد کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نظیر اکبر آبادی لکھا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسے میں استاد اور شاگرد کا رشتہ شاہراہِ ریشم پر کب تک چل سکتا ہے؟ ایک لڑکے نے معدنیات کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ تیل ہمارے ہاں مرید کے سے نکلتا ہے اور ایک نے یہ انکشاف فرمایا تھا کہ کوئلہ کہیں سے نہیں نکلتا۔ پہلے جنگل سے لکڑیاں کاٹی جاتی ہیں، پھر انھیں جلایا جاتا ہے تب کہیں کہ کوئلہ بن جاتا ہے۔

آخر میں ہم آپ کو انگریزی، اُردو اور تاریخ کے بارے میں چند نصیحتیں کرتے ہیں۔ انگریزی ایک لازمی مضمون ہے اور اس میں فیل ہونے والے کو ممتحن کے علاوہ فعل مستقبل کے سسرالی عزیز بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اگر آپ واقعی انگریزی سیکھنا چاہتے ہیں تو سیدھے امریکا یا انگلستان چلے جائیں، وہاں دھوبی، کنجڑا، نائی اور حلوائی اتنی خوب صورت انگریزی بولتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے انگریزی دان ان کی زبانیں نکلوا نکلوا کر دیکھتے ہیں اور انھیں اپنے نجیب الطرفین ہونے پر ندامت سی ہونے لگتی ہے۔ انگریزی کے پرچے میں Pair of words کا سوال اکثر آجاتا ہے۔ آپ سب جوڑوں

کو جوابی کاپی پر اتار کر نیچے لکھ دیں۔ "یہ سب جوڑے سلامت رہیں"! ایک سوال آتا ہے، خالی جگہ پُر کریں۔ ہمارے ہاں کسی محکمے میں تو کوئی جگہ خالی نہیں ہوتی مگر انگریزی کے پرچے میں بہت سی جگہیں خالی ہوتی ہیں۔ آپ ان جگہوں میں طوطا بنا دیں، کوا بنا دیں یا فاختہ، اس سے ایگزامینر یہ سمجھے گا کہ آپ پرندوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، جس کا نتیجہ لازماً انسانی دوستی ہوگا، اس طرح آپ کو مفت میں نمبر مل جائیں گے۔

اُردو ایک نہایت آسان مضمون ہے۔ جو اُردو میں فیل ہو جائے، اسے گھر والے زمین پر سلاتے ہیں۔ آپ اُردو کی تیاری کچھ یوں کریں۔ شاعروں کے حالات لے لیجئے، شاعر کا نام بدل دیں، حالات وہی رہیں گے۔ خلاصہ پوچھا ہو تو مرکزی خیال لکھ دیں، اس سے ممتحن کو آسانی رہے گی۔ سلیس کرتے ہوئے مشکل الفاظ گول کر جائیں۔ اس طرح جو عبارت آپ کے حصے میں آئے گی، وہ یقیناً سلیس ہوگی۔ مؤنث اور مذکر کا خیال رکھیں۔ اگر نہیں رکھیں گے تو آپ کو پٹھان سمجھ لیا جائے گا اور ممتحن ڈر کے مارے آپ کو اچھے نمبر دے گا۔

تاریخ ایک دل چسپ مضمون ہے۔ اسے دل چسپ سمجھ کر ہی پڑھیے۔ یہ مضمون دل چسپ اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے بادشاہوں، وزیروں اور ان کے سرخ، سنہرے، سفید اور سیاہ کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے بارے میں کبھی کینہ نہ رکھیے تاکہ خدانخواستہ اگر آپ بھی بادشاہ بن گئے تو کوئی آپ کے خلاف کینہ نہ رکھے۔ بادشاہوں سے بعض کام ہو جاتے ہیں مثلاً یہ کام سکندرِ اعظم سے ہو گیا۔ جب سکندرِ اعظم ہمدان آیا تو اس کی محبوبہ ہفستیون (Hafsatyun) نے وہیں انتقال کیا۔ اس کی موت نے سکندر کو اس قدر بے چین کر دیا کہ اس نے عالمِ غضب میں یہ حکم صادر فرما دیا کہ تمام اطباء جو

متوفی محبوبہ کے علاج معالجے میں ملوث تھے، موت کی نیند سلا دیا جائے۔ ایسے واقعات پڑھنے کے بعد آپ کا جی چاہے گا کہ پرچے میں سکندرِ اعظم کے خلاف ہاتھ اور دل کھول کر لکھا جائے لیکن یہ بادشاہوں کے لیے معمولی چیزیں ہیں۔ اگر آپ کو کسی بادشاہ کی حکمتِ عملی سے اختلاف ہے تو اس کے بارے میں کچھ اس قسم کی گوہر افشانی کیجیے۔

بادشاہ بہت سمجھ دار تھا اور زیرہ کھا کھا کر زیرک ہو چکا تھا۔ اس کی شجاعت اور شرافت پر کوئی انگشت نہ رکھ سکتا تھا۔ صرف اس میں ایک ہی کمزوری تھی، وہ یہ کہ سارا سارا دن بھنگ کے نشے میں دُھت رہتا تھا۔ اس کی تمام پالیسیاں بھنگ زدہ تھیں۔

اگر آپ کو کسی ایسے بادشاہ کے حالاتِ زندگی اور کارناموں پر قلم اٹھانا پڑ جائے، جس کے بارے میں خلاصے، ٹیسٹ پیپرز اور گائیڈیں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکیں تو پھر ''ربِ زِدنی علماً'' پڑھ کر لکھنا شروع کر دیں۔ ہر بادشاہ بچپن میں شہزادہ ہوتا ہے۔ شہزادہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے، توں توں وہ ''قریب التخت'' ہوتا جاتا ہے۔ آپ یہ جملہ بھی لکھ سکتے ہیں کہ بعض قریب التخت شہزادے اپنے باپ کو معزول کر کے فوراً بادشاہ بن جاتے ہیں۔ عقل مند شہزادوں کو یہ طریقہ زیب نہیں دیتا۔ وہ اپنے باپ کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں اور لکڑی کے تختے پر نہلانے کے بعد ہی تختِ حکومت پر بیٹھتے ہیں۔ ہر بادشاہ میں کوئی نہ کوئی سیاسی خوبی ہوتی ہے۔ آپ کسی ایک پر سیر حاصل بحث کا آغاز کر دیں۔ اکبر بادشاہ کے بارے میں لکھنا چنداں مشکل نہیں کیوں کہ وہ اَن پڑھ تھا اور اگر آپ اَن پڑھ شخص کے بارے میں کچھ بھی لکھ دیں تو ممتحن خوش ہوگا۔ ایک اَن پڑھ شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مثلاً ایسا شخص ضرور لڑاکا ہوگا بلکہ ٹکا دے کر لڑتا ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی مغل بادشاہ کے بارے میں لکھتے لکھتے بھول جائیں تو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کسی سڑک مثلاً جی ٹی روڈ کے

حالات بیان کر دیں۔ بادشاہ باغوں کے بھی رسیا ہوتے ہیں۔ دنیا میں وہ بدقسمت ہی بادشاہ ہوگا، جس نے کوئی باغ وغیرہ نہ بنوایا ہو۔ اسی طرح بعض بادشاہ باغوں کی بجائے جنگلات بنوا دیتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔

قبر کرائے کے لیے خالی ہے

ہمارے ہاں جب کوئی چیز مہنگی ہوتی ہے تو ہر شخص یہ کہتا ہے کہ وہ اسے مہنگی ہونے سے قبل ہی خرید لیتا۔ مثلاً ہونڈا 70 موٹر سائیکل پینتیس ہزار سے ساٹھ ہزار ہوئی تو یار لوگ بہت پچھتائے۔ پچھلے دنوں شادی ہالوں کے کرائے میں اضافے کی خبریں آنے لگیں ہر شخص شادی کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا بلکہ بعض لوگ تو اپنی دوسری شادی کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ راولپنڈی میں وفات پانے والے شہریوں پر چار سے سات گنا اخراجات کا اضافہ کر دیا ہے۔ سادی قبر کی قیمت سو روپے سے بڑھا کر پانچ سو، اینٹوں والی قبر 610 سے بڑھا کر 1300 اور باکس قبر کی قیمت 900 سے 1500 روپے مقرر کی ہے۔ یہ خبر پڑھ کر بہت سے شہری پچھتائیں گے کہ وہ پہلے ہی کیوں نہیں مر گئے۔ انسان زندہ ہو تو وہ بھاؤ کم کرانے کے لیے بحث کر سکتا ہے، لڑ سکتا ہے، بھوک ہڑتال کر سکتا ہے اور جلوس وغیرہ نکال سکتا ہے۔ جس طرح اشیاء کی قیمتیں دن بدن بڑھ رہی ہیں، اسی طرح زندہ رہنا بھی دن بدن مشکل ہو رہا ہے بلکہ اب تو مرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اب تو لوگ اس قسم کی دعا بھی مانگنا شروع ہو گئے ہیں کہ غریب آدمی کو موت ہی نہ آئے۔ خوانخواستہ کسی گھر میں موت واقع ہو جائے تو اہلِ خانہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو بذریعہ ٹیلی فون، ٹیلیکس یا فیکس اطلاعات

دیتے ہیں۔ رکشہ، ٹیکسی، بس، کوچ اور جہاز بھی موت کے سائیڈ ایفیکٹس کے طور پر استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ نزدیک سے آنے والے مہمانوں کو صرف مشروبات پلانا اور دور سے آنے والوں کو کھانا وغیرہ کھلانا اور چڑیا گھر دکھانا پڑ جاتا ہے۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ قیامت والے دن ایک ایک قبر سے ستر ستر مردے برآمد ہوں گے۔ شہروں کے قبرستانوں میں ایک قبر میں دفن بھی اتنے ہی کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ان کے والدِ محترم کا انتقال ہوا تو انھوں نے انھیں نزدیکی قبرستان میں دفن کر دیا۔ قبر چوں کہ کچی تھی، اس لیے انھوں نے دائیں بائیں ابدی نیند سونے والوں کے نام پتے اور ذات برادری نشانی کے طور پر گوشۂ ذہن میں محفوظ کر لی۔ چند دن بعد ہمارا دوست اور ان کے بھائی فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان تشریف لے گئے تو قبرستان میں ان کے والد کی قبر کو چند نوجوانوں نے گھیرا ہوا تھا اور وہ اس پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ ہمارے دوست نے ان نوجوانوں سے پوچھا کہ آپ کس قبر پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں؟ انھوں نے ہمارے دوست کے والد صاحب کی قبر کی طرف اشارہ کیا ''جناب! اس قبر میں میرے ابا جان رہائش پذیر ہیں!'' ہمارے دوست نے انھیں بتایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ''جناب! آپ اپنے والد ماجد کی قبر بھول گئے ہیں، ہم نے گذشتہ شام اسی قبر میں اپنے والد صاحب کو سپردِ خاک کیا ہے''۔

گنجان آباد شہروں میں غریب غرباء کرائے دار جن مکانات میں رہتے ہیں، مالک ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوتا ہے۔ کرائے دار کو مالک کی طرف سے دی جانے والی سب سے بڑی سہولت یہی ہوتی ہے کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں جب چاہے، مالک کا چہرہ دیکھ لے۔ غریب کو مر کر بھی چین نصیب نہیں اور جس طرح ایک ایک قبر میں کئی

مردے دفن کیے جا رہے ہیں، اس طرح بے چارے کو مرنے کے بعد بھی پرائیویسی نصیب نہیں۔ اگر کوئی مُردہ دوسرے مُردے سے چھپ کر دیسی گھی اور پھل فروٹ کھانا چاہتا ہے یا بادام وغیرہ گھوٹ کر پینا چاہتا ہے تو وہ کیا کرے۔ اس کی زندگی مکانوں کے کرائے، بجلی پانی کے بل اور بچوں کے سکول کی فیسیں دینے ہی میں گزری ہوگی یعنی اس کی زندگانی تلخ کامی ہی میں گزری ہوگی۔ اب جانِ شیریں کے دینے سے اس کی زبان نے شاید کوئی حلاوت محسوس کی ہو۔

ہمارے ایک جاننے والے نے بتایا کہ ایک روز اس کے افسر نے اسے شہرِ خموشاں کا انچارج بنا دیا۔ ہمارے دوست کا خیال تھا کہ اس کے افسر نے اس سے کوئی پرانا بدلہ لیا ہے، جو اسے زندوں کی صف سے نکال کر مُردوں کی صف میں بھیج دیا ہے۔ دوسرے دن جونہی اس نے اپنے دفتر کا چارج سنبھالا، گورکن یکے بعد دیگرے حاضر ہونے لگے۔ ایک گورکن نے ''سلام صاحب'' کہتے ہوئے رومال کی پوٹلی اس کے سامنے رکھی۔ مُردوں کے درمیان بیٹھے ہوئے ہمارے دوست کی زندہ دلی ملاحظہ کیجیے ''اوئے ماکھے! ایک دن تم نے بھی خاک کا پیوند ہونا ہے، نذرانہ ایمان داری سے دینا'' صاحب جی! آج صرف چار ''تگ'' آئے تھے۔ ہمارے دوست نے بتایا کہ بات اگر نذرانے تک رہتی تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص اپنے مُردے کو اچھی قبر دلانے، اسے اچھا اور پڑھا لکھا ہمسایہ مہیا کرنے اور اس کی قبر کے نزدیک پانی بجلی کی سہولت فراہم کرنے پر گورکن کو ٹپ دے دیتا تو یہ اس غریب کی نیک نیتی اور محنت کا صلہ تھا لیکن اب حضرتِ انساں کی عریانی دور تک پہنچ چکی ہے۔ رات کو دفن ہونے والے مُردے صبح کی اذان ہونے سے پہلے نیچرل ڈریس میں آ جاتے ہیں۔ زندوں سے دھوکا فریب تو چلتا ہی ہے، اب مُردوں کو

بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ اب وہ دن دور نہیں، جب مُردے جلوس کی شکل میں اٹھ کھڑے ہوں گے، چلا چلا کر کہیں گے کہ انھیں الگ الگ قبروں میں دفنایا جائے۔ انھیں کفن وغیرہ بھی پہنایا جائے اور اُن کے سپیئر پارٹس میڈیکل کالجوں سے واپس دلائے جائیں۔ شہروں میں جس طرح قبرستانوں میں خالی جگہ کا ملنا محال ہو گیا ہے، اگر یہی حال رہا تو شاید اخبارات میں قبروں کے اشتہارات آنے شروع ہو جائیں۔

قبر کرائے کے لیے خالی ہے۔

ایک کشادہ ہوادار اور دکان نما قبر جس کے سر پر سکھ چین کا درخت ہے، کرائے کے لیے خالی ہے۔ اس کا کرایہ پچاس روپے مہینا ہے۔ اس کے نزدیک سرکاری نلکا موجود ہے اور سرکاری کھمبے پر ایک عدد ٹیوب نصب ہے، جس کا بل مُردے کو الگ سے جمع کرانا ہو گا۔ قبر کا پہلا مُردہ ڈیپوٹیشن پر سعودی عرب گیا ہوا ہے۔

اب تو یہ ڈر ہے کہ مُردے مہنگائی کی وجہ سے کہیں یہ نہ کہ اٹھیں۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ڈیانا فرشتوں کے روبرو

(ڈیانا کی روح سے معذرت کے ساتھ)

منظر......ایک قبر، جس میں ایک تابوت رکھا ہوا ہے۔ فرشتے قبر میں آتے ہیں۔ فرشتوں کے حکم پر لیڈی ڈیانا تابوت سے اپنا سر باہر نکالتی ہے۔ ایک فرشتہ دوپٹے سے لیڈی کا سر ڈھانپ رہا ہے۔ مُردوں میں سے بہت سے مُردے، جو اپنی زندگی میں صحافت جیسے باعزت پیشے سے منسلک تھے اور رپورٹرز اور فوٹوگرافرز تھے۔ پہلے سے قبرستان میں کوریج کے لیے موجود ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے قبر ایک وسیع و عریض میدان میں بدل جاتی ہے، جہاں مُردوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے ہیں۔ سکندرِ اعظم، نپولین، ہٹلر اور چرچل وغیرہ اگلی صفوں میں موجود ہیں۔ ایک طرف کونے میں مونا لیزا دبکی بیٹھی ہے اور اپنی مسکراہٹ کو چھپا رہی ہے۔ ایک فرشتہ الگ سے ایک کرسی پر تشریف رکھتا ہے۔ جس کے سامنے ایک میز رکھی ہے۔ جس پر کچھ کاغذات اور ایک بال پوائنٹ پڑا ہے۔ میز پر رکھے گتے پر مارکر سے ''جج'' لکھا ہوا ہے، جس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ یہ فرشتہ لیڈی کے صحیح اور غلط جوابات کا اندازہ اس کے تلفظ اور ادائیگی کے مطابق کرتے ہوئے نمبر دے گا۔

فرشتہ اوّل: ''لیڈی آپ کا رب کونسا ہے؟''

لیڈی ڈیانا: ''میرا رب وہی ہے، جو تمام جہانوں کا مالک اور پالنے والا ہے۔''

فرشتہ 1: ''تھوڑی سی وضاحت کر دیں''

لیڈی ڈیانا: ''مشرقوں اور مغربوں کا رب''

فرشتہ 1: ''اپنے پیغمبر کا نام بتائیے''۔

لیڈی ڈیانا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام، جو مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

فرشتہ: ''اپنی الہامی کتاب کا نام لیجئے''

لیڈی ڈیانا: ''انجیلِ مقدس''

فرشتہ اوّل: (فرشتہ دوم سے کہتا ہے کہ اب اگر تم نے لیڈی سے کچھ عام مُردوں اور مشہور مُردہ شخصیات کی دلچسپی کے لیے سوالات کرنے ہیں تو کرلو)

فرشتہ دوم: لیڈی جیسا کہ اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ تم نے اپنے کیریئر کا آغاز معلّمہ کی حیثیت سے کیا۔ تمہارے پاس علم تھا، کیریئر والی سائیکل تھی۔ اگر تم پڑھاتی رہتی تو اب تک پرنسپل ہو چکی ہوتی اور آج تمہارا پڑھایا ہوا ایک آدھ لفظ نیکی کی صورت میں تمہارے کام آجاتا اور تم پُل صراط سے باآسانی گزر جاتی۔ عام معلّمہ سے شہزادی...... یہ کیسے ہو گیا؟''

لیڈی ڈیانا: (مُردہ سامعین سے مخاطب ہوکر)

''آئی ونڈر! میری قسمت ایسے بدل گئی، جیسے کسی زمانے میں پاکستانی فلموں میں ہیروئن کی بدلا کرتی تھی کہ کوئی پہاڑی غریب لڑکی لکڑیاں چنتی ہوئی کسی شہری بابو کی کار سے جاٹکراتی تھی۔ اس طرح وہ براستہ ہسپتال ہیرو کے دل اور اس کی کوٹھی میں گھر کر لیتی تھی۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ اس ذات نے مجھے استانی سے شہزادی بنایا۔ ورنہ ایک عام استانی کی خواب میں بھی کسی شہزادی کا گزر نہیں ہوتا۔ ایک بات پر میں بہت حیران ہوئی کہ پاکستان میں ہر وہ لڑکی یا لڑکا شہزادی یا شہزادہ کہلاتا ہے، جو پڑھائی میں بہت کمزور ہوتی ہے/ ہوتا ہے''۔

فرشتہ دوم: لیڈی تمہارا ہیئر اسٹائل بہت مشہور ہوا اور سفرِ آخرت پر بھی تم اسی ہیئر اسٹائل میں روانہ ہوئی تھی۔ کیا اس اسٹائل سے کبھی الجھن ہوئی ہے۔ اس کے کاپی رائٹ کے بارے میں سامعین کو بتایئے۔ ویسے جب کوئی مسلمان لڑکی اس قسم کے ہیئر اسٹائل میں عالمِ فنا سے عالمِ بقا میں آتی ہے تو اس کی بخشش کی راہ میں یہ ہیئر اسٹائل حائل ہو جاتا ہے۔ پھر شماریات جاننے والے کسی فرشتے کی خدمات لے کر یہ پوچھا جاتا ہے کہ اس نے اوسطاً کتنے دن، کتنے مہینے اور

کتنے سال اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپے رکھا"۔

لیڈی ڈیانا: "ایکس ایکوزمی ڈیئر اینجل! میرے نمبر تو کم نہیں ہوں گے۔ اس اسٹائل میں تازہ ہوا کے جھونکے میرے گیسوئے تابدار سے گزرتے ہوئے میرے دماغ کو تروتازہ کر دیتے تھے۔ ڈیئر اینجل! میں کاپی رائٹ محفوظ کرا کے اپنے بالوں پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ جہاں لوگ بالوں کو فوراً کنگھی کر لیتے ہیں، وہاں کاپی بھی کر لیا کریں۔ البتہ مجھے فکر پڑ گئی ہے کہ اس ہیئر اسٹائل سے نمبر کچھ کم ہو جاتے ہیں۔ ذرا بتا دیجئے میرے کتنے نمبر آئے ہیں؟"

فرشتہ 2: ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اخلاقیات، مسکراہٹ اور دکھی انسانیت کی خدمت کے نمبر ابھی رہتے ہیں۔"

لیڈی ڈیانا: (پریشانی کے عالم میں اپنے بال سیٹ کرتے ہوئے) "ڈیئر اینجل! میرے لباس پر تو آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں"۔

فرشتہ 2: "لیڈی! تم پڑھی لکھی ہو۔ اگر دنیا میں پبلک سروس کمیشن وغیرہ میں امیدوار کا لباس دیکھا جاتا ہے اور اس کے کچھ نمبر بھی دیے جاتے ہیں تو آخرت میں لباس کو کیوں نہ مدِنظر رکھا جائے۔ ہاں تمہارا ریکارڈ ابھی سامنے آجاتا

ہے۔ فرشتہ دوم کسی تیسرے فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ وہ برطانیہ، امریکا اور فرانس کے صرف پچھلے دس سالہ اخبارات اور رسائل و جرائد لے آئے اور ساتھ ہی پاکستان کے مشہور روزنامے بھی لے آئے''۔

(فرشتہ فوراً تمام اخبارات ایک انگلی پر اٹھا کر لے آتا ہے)

''لیڈی یہ وہ تمام ملبوسات ہیں، جو تم دنیا میں زیب تن کیا کرتی تھی۔ صرف ایک بات تمہارے حق میں جاتی ہے کہ جس روز تم نے پاکستان خصوصاً لاہور جا کر شلوار قمیص پہنی تھی، اسی روز تمہاری میز جیسی ٹانگیں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ اس کے کچھ نمبر ملنے کا قوی امکان ہے''۔

(اتنے میں ایک صحافی سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ اسے اجازت مل جاتی ہے۔)

صحافی: (لیڈی ڈیانا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) آنریبل لیڈی! آپ کی دنیا میں اَن گنت تصاویر کھینچی گئیں۔ آپ اگر ان کی رائلٹی کے بارے میں کوئی وصیت کر آتیں تو کئی غریب ملکوں کا بھلا ہو جاتا۔

لیڈی ڈیانا: (افسوس زدہ لہجے میں) ''تم بہت ذہین صحافی ہو لیکن یہ خیال تمہیں اور مجھے مرنے کے بعد سوجھا ہے۔ واقعی میری تصویروں کی رائلٹی سے بہت سے غریب ملکوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے''۔

صحافی: لیڈی! آپ کے پاکستان میں بہت سے مداحین پائے جاتے ہیں۔ بابا کبوتراں والا، ماسی تندور والی، لبھا دودھ دہی والا اور گھا رکشے والا تمہاری مرنے کی خبر سن کر تو ''کومے'' میں چلے گئے اور سنا ہے کہ ابھی تک انھوں نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ خدشہ ہے کہ ان کا ''کوما'' کہیں فل سٹاپ میں نہ بدل جائے۔ فی الحال آپ ان کے لیے کسی گرانٹ وغیرہ کا اعلان کریں گی''۔

لیڈی ڈیانا: ''مجھے خود سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا تھی۔ لوگ تو کسی رشتے دار کی موت پر کھانا پینا نہیں چھوڑتے، میں ان کی کیا لگتی تھی؟ میں انھیں یہی کہوں گی کہ کھائیں پئیں، جان بنائیں اور کھانا پینا میرا چھوٹا ہے، یہ لوگ تو کھانا نہ چھوڑیں۔ میں تو انھیں یہی کہوں گی کہ جہاں تک ہو سکے، دکھی انسانوں کی خدمت کیا کریں۔

لیڈی ڈیانا: (فرشتے سے)
''ڈیئر انجل! یہ پریس کیا چیز ہے؟ میں فوٹوگرافروں کے خوف سے بھاگ کھڑی ہوئی اور بھاگتے بھاگتے اس دنیا میں آگئی''۔

فرشتہ: ''لیڈی! تمھیں صرف خدا سے ڈرنا چاہیے تھا۔ بہرحال یہ پریس جس کو اٹھانا چاہیے، آسمان تک اٹھا دیتا ہے، جیسے

تمہیں زمین سے آسمان تک پہنچا دیا۔ ویسے پریس کے آگے بھاگتے بھاگتے بڑی بڑی حکومتیں اپنے گھر پہنچ جاتی ہیں، تم تو صرف ''پرنسس آف ویلز'' تھی۔ تم نے یہ مصرع تو سنا ہوگا۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے''

فرشتہ اوّل: (ڈیانا سے) اگر تم کلمہ پڑھ لیتی تو تمہاری فرسٹ ڈویژن آنی تھی۔ تم نے مسلمانوں سے اتنا میل جول رکھا حتّٰی کہ سفرِ آخرت میں ایک مسلمان ہی کے ساتھ روانہ ہوئی''۔

لیڈی ڈیانا: ''ڈیئریسٹ اینجل! سوسوری، او مائی گاڈ!! مجھے قبر کے حساب اور اس قسم کی دیگر مشکلات کا قطعاً علم نہیں تھا۔ میں نے مسجدیں تو بہت سی دیکھیں اور مولوی بھی بہت سے دیکھے۔ مسجدوں پر میں نے ''کیا کہا آپ نے؟'' فرشتے نے فوراً ''لقمہ دیا'' کلمہ طیب ''ہاں'' (انگریزی لہجے میں ہاں وہی وہی) لکھا دیکھا۔ اگر آپ نے اخبار پڑھا ہو تو آپ جانتے ہوں گے کہ جس روز میں بادشاہی مسجد لاہور میں داخل ہوئی، اس روز میرے دل میں کچھ کچھ ہوا تھا۔ اس روز ایک داڑھی والے شخص نے (اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) مجھے قرآنِ پاک کا نسخہ بھی دیا اور میرے سر پر چادر بھی دے دی۔ چادر سے مجھے کافی گرمی محسوس ہوئی۔ جہاں میں نے یہ تحفے قبول کر لیے

وہاں میرے لیے کلمہ پڑھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔
سوسوری، او مائی گاڈ!"

فرشتہ 1: "یہاں "سوری" وغیرہ سے کام نہیں چلتا۔ یہ کلاس روم کی اصطلاح ہے، جو طلبہ اور طالبات اسے کھانسے، چھینکنے، سبق یاد نہ کر کے اور ایک دوسرے کو تھپڑ مار کر استعمال کرتے ہیں"۔

اتنے میں کسی طرف سے آواز آتی ہے۔

کینا سوہنا تینوں رب نے بنایا
تے جی کرے ویکھدا رہواں

پھر ایک فرشتہ سب فرشتوں سے مذہب، مسکراہٹ، دکھی انسانیت کی خدمت اور لباس کے نمبروں کی فہرستیں جمع کرتا ہے، پھر فرشتے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایک طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور دوسری جانب دودھ اور شہد کی نہریں بہ رہی ہیں اور ان کے درمیان فیصلے کا منتظر لیڈی کا مسکراتا ہوا خوب صورت چہرہ۔ آخر فیصلہ محفوظ کر لیا جاتا ہے.....

❁❁❁

گھوڑے، گدھے اور انسان

ہم کالم کے آغاز ہی میں آپ کو بتا دیتے ہیں کہ شمالی علاقہ جات سے ہماری مراد ہرگز وادیٔ کاغان یا وادیٔ ناران وغیرہ نہیں بلکہ ہم لاہور کے شمالی علاقہ جات مصری شاہ، وَن پورہ، شاد باغ اور بھگت پورہ کے بارے میں کچھ عرض معروض کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں صحیح معنوں میں یہی پوش علاقے ہیں کیوں کہ یہاں سفید پوش لوگ کثیر تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ جو حضرات اک موریہ اور دو موریہ پُل صراط سے نہیں گزرے وہ اگر لاہور کے شمالی علاقے شاد باغ منزلِ مراد کی طرف آنا چاہیں تو اپنے ہم راہ وقت اور صبر جیسی دو قیمتی چیزیں ضرور لائیں کیوں کہ جتنا وقت کوٹ لکھپت سے اک موریہ پُل تک صرف ہوگا۔ اس سے تِگنا وقت اِن شَاءَاللہ اک موریہ پُل سے شاد باغ تک پہنچنے کے لیے درکار ہوگا۔ ہم قبل از وقت اس لیے یہ بات آپ کے گوش گزار کر رہے ہیں کہ کل کو آپ یہ نہ کہتے پھریں کہ ہم نے وقت ہی کم دیا تھا۔

اِک موریہ پُل پر آپ ضرور رکیں گے اور آپ کو پتہ چلے گا کہ یہاں تانگوں، ریڑھوں اور ریڑھیوں کے آگے کیسے کیسے ضدی گھوڑے اور گدھے جُتے ہیں۔ ہم دور کیوں جائیں، ہم شمالی علاقوں کے رہنے والے لوگوں کو دن میں متعدد بار خود پر حیوان ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ یہی نہیں، آتے جاتے ہم گھوڑوں کا منہ چومتے اور ''چمواتے'' ہیں۔ ابھی

ہم کل ہی اپنے بچوں کو ان کی درس گاہ میں چھوڑنے جا رہے تھے کہ سڑک پر بیل گاڑی، گدھا گاڑی اور خچر گاڑی نظر آئی۔ یہ گاڑیاں اس طرح جا رہی تھیں کہ ان گاڑیوں کے جانوروں کی ناکیں بھی برابر کی سطح پر محوِ سفر تھیں۔ جب ہم نے اپنی کے ایم ڈبلیو موٹر بائیک ان جانوروں کے برابر کی تو ہمیں واقعتاً خود پر ہنسی آ گئی۔ ہم نے فوراً اپنے بچوں سے کہا کہ پیارے بچو! آپ ذرا اپنے پاپا کا چہرہ، خچر کا چہرہ، بیل کا چہرہ اور کسی اور جانور کا چہرہ، جسے ہم جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں ملاحظہ فرمائیں، آپ کو یقین آجائے گا کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔

شمالی علاقے کی ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ جو شخص اِک موریہ یا دو موریہ پُل سے لے کر شادباغ تک موٹر سائیکل یا کار بخیر و عافیت چلا کر لے جائے، اسے ایف سولہ کا لائسنس بھی باآسانی مل سکتا ہے۔ ہم موٹر سائیکل چلا رہے ہوں تو پیدل حضرات ہم سے آگے نکل جاتے ہیں کیوں کہ ہم موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے بریکیں لگاتے رہتے ہیں۔ شمالی علاقوں میں موٹر سائیکل چلانے کے بہت سے آداب ہیں۔ مثلاً آپ کے موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ، تانگے یا ریڑھے کے پہیے کے ساتھ یوں حرکت کرے، جیسے وہ تانگے کے ساتھ ہی بندھا ہے۔ تانگے کے پیچھے موٹر سائیکل جا رہی ہو تو موٹر سائیکل کا پہیہ تانگے کے پہیے کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں راستہ لینے کے لیے کسی قسم کے ہارن، باجے اور نالے کی ضرورت نہیں، اس لیے بعض لوگ راستہ لینے کے لیے نازیبا کلمات اور مہمل الفاظ استعمال کرتے ہوئے اپنی سواری سے ہاتھا پائی پر اتر آتے ہیں۔ جس سے راستہ مزید بند ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں صرف موٹر سائیکل سواروں اور اہل کاروں ہی کو مشکل پیش نہیں آتی۔ پیدل حضرات کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً وہ کھُل کر بازو نہیں

ہلا سکتے۔ اب یہاں شاید ساکن بازوؤں والے لوگوں کو ضرورت ہے یا لوگ اپنے بازو پیچھے باندھ کر چلا کریں۔

شمالی علاقوں کے موٹر سائیکل اور سائیکل سواروں کو اپنی موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں صاف کرنے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی کیوں کہ یہ سڑک پر ہی ایک دوسرے کی پتلونوں اور شلواروں سے صاف ہوتی رہتی ہیں۔

زیادہ رش ہو تو سائیکل سوار اپنی سائیکل کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دوڑ لگا دیتے ہیں۔ پیدل خواتین تانگوں کے اوپر اور رکشاؤں کے بیچ میں سے سڑک عبور کر لیتی ہیں اور حضرات گھوڑوں، بیلوں اور خچروں کی ٹانگوں کے درمیان سے سڑک کراس کر لیتے ہیں۔

آپ نہ صرف اپنے سامنے والی سواریوں پر نظر رکھیں بلکہ آپ کو غیب کا علم بھی ہونا چاہیے کہ آپ کے تعاقب میں کون کونسی ہستیاں آ رہی ہیں کیوں کہ پیچھے آنے والے لوگ آپ کی گاڑی کی نمبر پلیٹ توڑ کر یہ بھی کہہ دیتے ہیں "آپ آگے ہی دیکھ رہے ہیں، پیچھے دیکھ کر ہی نہیں چلتے" چلتی کاروں کے دروازے کھولنا، سٹیرنگ پر بیٹھ کر پیسے گننا، اخبار پڑھنا، سیب کھانا، اور ٹیلی فون کال کرنا معمول کی باتیں ہیں۔ آپ سے آگے جانے والا کسی وقت، کسی طرف بھی مڑ کر آپ کا رخ کسی طرف بھی موڑ سکتا ہے۔ آپ کسی تانگے کو اوورٹیک کر رہے ہیں تو کوئی معزز خاتون آپ کی ٹینکی پر بھی لینڈ کر سکتی ہے۔

شمالی علاقوں کے لوگ صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھروں سے کام پر روانہ تو ہو جاتے ہیں لیکن کئی مرتبہ راستے ہی سے دوبارہ کپڑے پہننے گھر لوٹ آتے ہیں۔ اس لیے اب ضروری ہو گیا ہے کہ یہ لوگ دو تین سوٹ اپنے ساتھ فالتو رکھ لیا کریں۔

ان دنوں شمالی علاقوں میں ایک ٹرینڈ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بندہ اچھا بھلا اپنی

بائیک پر جا رہا ہے کہ اچانک اس پر کھلتا ہے کہ اس کے چہرے پر ایک گول سی متحرک شے آ رہی ہے۔ غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ سامنے سے آنے والے صاحب اپنی بائیک یا سائیکل کے اگلے پہیے کو اٹھا کر صرف پچھلے پہیے پر آ رہے ہیں۔ آپ سے کوئی پوچھے کہ تم نے کیا مزا پایا؟ ہمارے ذہن میں بھی یہ بات آ رہی ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکے۔ شاید اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے ٹائروں پر کھڑے ہونا سیکھ رہے ہیں۔ یہ کم خرچ اور بالانشین طریقہ ہے کیوں کہ موٹر سائیکل یا سائیکل کا صرف ایک ہی ٹائر گھسا کرے گا۔ ہمارے شمالی علاقوں کی اور بھی بے شمار خوبیاں ہیں، جنہیں ہم کسی مناسب وقت کے لیے اپنے سر پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ خاص کر ہمارا خدا حافظ!

"مزاج بخیر" کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ میرے اُداس لمحوں کی رفیق ہے۔

سید ضمیر جعفری

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔ قارئین جب یہ مضامین پڑھ کر لطف اندوز ہو چکیں گے تو سوچ کی لہر ان کے ذہن میں آہستگی سے در آئے گی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

تنویر حسین کی "مزاج بخیر" کی تحریر موتیوں کی مالا جیسی ہے اور پہاڑی ندی کی طرح لہراتی، گنگناتی اور اٹکھیلیاں کرتی رُوح کو سیراب کرتی ہے۔

بشریٰ رحمان